فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف ۔ اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین ، اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین ، اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	"

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

صدیق احمد

نمبر ۵ ماہ شوال المکرم ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۸ء جلد ۸۱

فہرست مضامین

شذرات

انجمن ترقی اردو کا وفد گذشتہ مہینہ ۲۹ر اپریل کو صدر جمہوریہ سے ملا اور اردو کے پہلے میمورنڈم کی یاد دہانی کر کے دوبارہ اس کے قانونی حقوق اور مطالبات کی تفصیلی عرضداشت پیش کر دی، پہلے خیال تھا کہ اس کے فیصلہ کا اختیار صدر جمہوریہ کو ہے مگر ان کے جواب سے ظاہر ہوا کہ حکومت اس کا فیصلہ کرے گی اور وہ بہت جلد اس عرضداشت کو حکومت کے سامنے پیش کر دینگے، اس جواب نے ایک نئی شکل پیدا کر دی ہے جو غالباً اردو کے لیے زیادہ مفید ہو۔

اردو کا مقدمہ ہر حیثیت سے اسقدر مضبوط اور اتنا کھلا ہوا ہے کہ اس کے فیصلہ میں کوئی تذبذب نہ ہونا چاہیے، یہ اردو کی بدقسمتی اور ہماری ذہنیتوں کی خرابی ہے کہ ایسے کھلے ہوئے مسئلہ کو بھی جو دو اور دو چار کی طرح واضح ہے قابل بحث بنا دیا ہے، ارکانِ حکومت میں سے یہ کسکو نہیں معلوم کہ اردو ہندوستان کی ایک مشترک اور مقبول عام زبان ہے جس کے بولنے والے کروروں ہیں، وہ دلی، اتر پردیش اور بہار کے ایک بڑے طبقہ کی مادری زبان ہے، اس کے علاوہ مختلف ریاستوں میں اس کے لاکھوں بولنے والے ہیں اور انکا سارا کاروبار اردو میں ہوتا ہے، یہ اردو کی بدقسمتی اور صوبائی حکومتوں کی تنگ نظری ہے کہ ایسی ہندوستان گیر زبان ان حقوق سے بھی محروم ہے جو بہت سی ادنیٰ ادنیٰ زبانوں کو حاصل ہیں۔

اس موقع پر اردو کے پرانے محسن اور بہار کے صوبہ کے وزیر اعلیٰ کی یہ پیش بندی

لائق داد ہے کہ اس خطرے سے کہ مبادا مرکزی حکومت اردو کے بارہ میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر دے جو ان کی پالیسی کے خلاف ہو، انھوں نے پہلے ہی یہ واضح کر دیا کہ اس عرضداشت سے ان کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اردو اس صوبہ کی علاقائی زبان نہیں بنائی جا سکتی، یہ گویا مرکزی حکومت کو ایک طرح کی تنبیہ ہے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے جو ان کے لیے ناقابلِ قبول ہو،

صوبائی حکومتوں کا جو حال بھی ہو لیکن مرکزی حکومت حتی الامکان اپنا دامن تعصب و تنگ نظری سے پاک رکھنے کی کوشش کرتی ہے، اور اسی سے ہندوستان کی سیکلرزم کا بھرم قائم ہے، اور اس میں اتنی قوت بھی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو ریاستوں سے منوا بھی لیتی ہے جس کا ثبوت وہ ریاستوں کی جدید تشکیل اور دوسرے اہم معاملات میں دے چکی ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اردو کے معاملہ میں وہ بھی بے بس ہو جاتی ہے، ورنہ اردو کی حمایت میں پنڈت جواہر لال نہرو کی آواز بے اثر نہ رہتی، اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا مسئلہ مقدمہ کی شکل میں ابتک حکومت کے سامنے پیش ہی نہیں ہوا اور پنڈت جی جو کچھ کہتے تھے، اس کی حیثیت محض نیک مشورے کی تھی، مگر اب یہ مقدمہ پیش ہو گیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اب حکومت اس کا کیا فیصلہ کرتی ہے۔

درحقیقت اردو کا مسئلہ حکومت ہند کی جمہوریت اور سیکلرزم کا ایک بڑا امتحان ہے جس کا اثر ہندوستان کے پیچیدہ لسانی مسائل پر بھی پڑیگا، اگر اردو جیسی ترقی یافتہ مشترک اور مقبول عام زبان کو بھی حقوق نہیں ملتے تو دوسری زبانوں کے حقوق کے تحفظ کی کیا ضمانت ہوگی، اور ہندوستان اور اس کے باہر دوسرے ملکوں میں اس کا کیا اثر پڑے گا، یہ بھی جمہوریت کا عجوبہ ہے کہ ہندوستان کی بہت سی ادنیٰ ادنیٰ بولیوں کا جن کی اردو کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، ایک وطن ہے جہاں انکو اپنی نشو و نما اور ترقی کے

پورے مواقع حاصل ہیں اور اردو جیسی زبان کا ابتک کوئی وطن ہی متعین نہیں ہوا ہے، حقوق کا سوال تو اس کے بعد کا ہے۔

افسوس ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو بھی فرقہ پرستوں نے قابل بحث بنا دیا ہے کہ اردو کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ ان تمام فرقوں کا ہے جنکی مادری زبان اردو ہے، یا وہ اردو بولتے ہیں، اسکا تازہ ثبوت یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کے وفد میں ہندو ارکان کی تعداد زیادہ تھی جس میں ڈاکٹر تاراچند، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، مرکزی حکومت کے سابق وزیر خارجہ شری راج بہادر گوڑ، سردار حکم سنگھ ڈپٹی اسپیکر پارلیمنٹ مسز ارونا آصف علی جیسے ممتاز ہندو اور سکھ شامل تھے، گو یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے لیکن اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہے تب بھی کیا ہندوستان کے ۴ ۱/۲ کروڑ مسلمانوں کی زبان کو ایک جمہوری حکومت میں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، ایسی حکومت کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کیا ہوں گے، وہ کس طرح اس پر اعتماد کر سکتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں ایسی جمہوریت کے متعلق کیا رائے قائم ہوگی، اس لیے اردو کا مسئلہ تنہا کسی فرقہ کا یا محض لسانی نہیں بلکہ ہندوستان کی جمہوریت کی ساکھ کا ہے،

ہندی والوں کے استبداد و تنگ نظری نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جو نازک صورتِ حال پیدا کر دی ہے اس سے حکومت کو سبق حاصل کرنا چاہیے، اس موقع پر یہ بھی یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا کہ اگر ارکانِ حکومت کے دلوں میں کچھ بھی مولانا ابو الکلام کی یاد باقی ہے تو اردو کے بارہ میں ان کی آخری وصیت کی تعمیل ضروری ہے، اردو ان کی محبوب زبان تھی اس کو زندہ رکھنا ان کی سب سے بڑی یادگار ہے، اس سے ان کی روح زیادہ خوش ہوگی ورنہ یہ سمجھا جائیگا کہ مولانا سے تعلق کا دعوی اور ان کی موت پر اظہار غم محض زبانی ہے، اس لیے ہم کو توقع ہے کہ حکومت ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اردو کے بارہ میں فیصلہ کرے گی،

مقالات

میر کی داستان

(ذکر میر کی روشنی میں)

از جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر، پٹنہ

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

میر محمد تقی میر (۱۱۳۵ھ - ۱۲۲۵ھ) صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ادیب بھی تھے، کلیات میر کے علاوہ جو چھ دیوانوں پر مشتمل ہے[1] میر نے نثر میں بھی تین کتابیں تصنیف کیں (۱) نکات الشعراء (۲) ذکر میر (۳) فیض میر۔ نکات الشعراء شاعروں کا تذکرہ ہے جو ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا، ذکر میر میر کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ۱۱۸۶ھ میں پہلی بار اور نظر ثانی کے بعد ۱۱۹۷ھ میں کچھ اضافہ کے ساتھ دوسری بار مرتب ہوئی، فیض میر میر نے اپنے بڑے لڑکے میر فیض علی فیض کے لیے لکھی تھی، یہ تینوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں،

---

[1] یہ چھ دواوین صرف غزلوں کے ہیں، جو ۱۰۴ صفحات کو محیط ہیں، دیوان اول میں ۹ قصائد بھی ہیں، ان کے علاوہ فردیات، رباعیات، مخمسات، واسوخت اور مثنویاں ۵۰۰ صفحات میں ہیں (نولکشور ایڈیشن قدیم)

ذکر میر میر کی ایک قابل قدر اور اہم کتاب ہے جس سے میر کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، اور بعض باتیں غلط ثابت ہو جاتی ہیں جن کو آزاد وغیرہ نے شہرت دی تھی، میر کے حالات کے علاوہ اس کتاب سے اس دور کے کچھ سیاسی اور سماجی حالات بھی معلوم ہوتے ہیں، اور محمد شاہ سے لیکر شاہ عالم تک کے دوران حکومت کے تاریخی واقعات بھی اس میں پائے جاتے ہیں، غرض ذکر میر ایک اچھی خاصی دلچسپ کتاب ہے اور مفید بھی، گو کچھ باتیں مبالغہ آمیز و غیر صحیح بھی ہیں،

ذکر میر کا پہلا نسخہ ۱۱۸۶ھ میں مرتب ہوا تھا، اس نسخہ میں خود میر نے ذکر میر کا سنہ تصنیف یوں ظاہر کیا ہے ؎

مسمی باسمے شد اے باہنر — کہ این نسخہ گردد بہ عالم سمر

ز تاریخ آگہ شوی بے گماں — فزائی دہ و شش عدد گر بر آں

ذکر میر کے اعداد ۱۱۷۰ھ ہوتے ہیں، اس میں دہ و شش یعنی ۱۶ عدد ملانے سے ۱۱۸۶ھ بر آمد ہوتا ہے، تیسرا نسخہ ۱۱۹۷ھ میں مرتب ہوا، اس نسخہ میں مذکورہ بالا قطعہ تاریخ کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے ؎ فزائی عدد بست و ہفت اوبر آں۔ یعنی ذکر میر (۱۱۷۰ھ) کے اعداد میں بست و ہفت (۲۷) عدد ملائیں تو ۱۱۹۷ھ نکلتا ہے، اسی تیسرے نسخہ کو انجمن ترقی اردو نے ڈاکٹر عبد الحق کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۸ھ میں شائع کر دیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس نسخہ کے آخر میں جو قطعہ تاریخ ہوگا اس کو خارج کر کے مقدمہ میں درج کیا ہے،

ذکر میر میں متوسط سائز کے ۱۵۳ صفحات ہیں، اس میں بہت کچھ تاریخی واقعات درج ہیں لیکن کسی واقعہ کا سنہ مذکور نہیں، میر نے اپنے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اجداد میں سے کسی کا بھی نام نہیں بتایا، انھوں نے صرف اپنے والد (میر محمد علی عرف علی متقی)، سوتیلے ماموں (سراج الدین علی خان آرزو)[1]، سوتیلے بھائی (حافظ محمد حسن)، اپنے چھوٹے بھائی

(میر محمد رضی) اور اپنے بڑے لڑکے (میر فیض علی فیض)[1] کے نام بتائے ہیں، کتاب کی عبارت صاف اور سادہ، سلیس و رواں ہے مگر کہیں کہیں مشکل الفاظ و محاورات ہیں، جن کے معنی حاشیے میں دیدیے گئے ہیں،

اس کتاب میں میر نے سیادت کا دعویٰ کیا ہے، لیکن ہندوستان کے مشہور محقق قاضی عبد الودود عظیم آبادی نے تذکرۂ شورش[2]، مسرت افزا[3] وغیرہ کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ میر شیخ تھے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ان کی والدہ غیر کفو کی عورت تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ خان آرزو اور ان کے حقیقی بھانجے حافظ محمد حسن ان سے نفرت کرتے تھے، میر نے اس کتاب میں اپنی ماں کا ذکر تک نہ کیا کہ وہ کس خاندان کی تھیں، قاضی صاحب کا خیال ہے کہ خاموشی کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ مجہول النسب تھیں،

اپنے خاندان کے متعلق میر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ان کے اجداد حجاز سے دکن میں وارد ہوئے اور مصائب جھیلنے کے بعد احمد آباد (گجرات) پہنچے، بعض افراد وہیں رہ گئے اور بعض افراد تلاش روزگار میں آگے بڑھے، چنانچہ میر کے دادا نے اکبر آباد (آگرہ) میں توطن اختیار کر لیا، لیکن آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے بیمار پڑ گئے اور عالم جاودانی کو سدھارے، ان کے صرف ایک لڑکے تھے جو میر کے دادا تھے، وہ ہمت سے کام لے کر

(حاشیہ ص ۳۲۶) [1] خان آرزو کا مسقط الراس اکبر آباد تھا اور گوالیار میں ننہیال تھی، فرخ سیر کے زمانے میں وہ گوالیار میں منصب دار مقرر ہوئے، ۱۱۳۲ھ میں دہلی پہنچے، سنہ پیدائش ۱۰۹۹ھ تھا، ۱۱۶۹ھ میں انتقال ہوا،

(حواشی ص ہذا) [1] فیض بڑے لڑکے تھے، عسکری عرف میر کلو عرش چھوٹے تھے، کیونکہ اول الذکر کا ذکر ذکر میر میں ہے اور ثانی الذکر کا نہیں، کیونکہ وہ اس وقت تک پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ [2] مؤلفہ غلام حسین خاں شورش عظیم آبادی متوفی ۱۱۹۵ھ، یہ تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں تمام ہوا [3] مؤلفہ ابو الحسن الہ آبادی (۱۱۹۳ھ)

تلاش روزگار میں سرگرداں رہے، اور آخرکار بدقت تمام آگرہ کے مضافات میں فوجدار مقرر ہو گئے، جب وہ پچاس برس کے ہوئے تو بیمار رہنے لگے، ابھی صحت یاب بھی نہ ہوئے تھے کہ گوالیار پہنچے، لیکن سفر کی صعوبت سے جانبر نہ ہو سکے، ان کے دو لڑکے تھے، بڑے لڑکے مجنون ہو کر مر گئے، چھوٹے لڑکے میر کے والد علی متقی تھے۔[1]

آزاد وغیرہ نے میر کے والد کا نام عبد اللہ بتایا ہے، لیکن ذکر میر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام محمد علی اور خطاب علی متقی تھا، اس کتاب میں میر نے اپنے والد کو میر علی متقی کے خطاب سے یاد کیا ہے، اور صرف ایک جگہ میر محمد علی یعنی اصلی نام بتایا ہے، ڈاکٹر عبد الحق کا یہ بیان کہ "ساری کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں کہ سوائے اس کے (علی متقی کے) ان کا کوئی اور نام بھی تھا" صحیح نہیں، کیونکہ خواجہ باسط نے امیر الامرا کے سامنے میر کا تعارف کرتے ہوئے ان کے اس سوال پر کہ "این پسر از کیست" امیر الامرا کو جواب دیا تھا کہ "از میر محمد علی است"[2]۔ ڈاکٹر صاحب کا سہو نظر حیرت انگیز ہے۔

میر علی متقی نے فقر و قناعت کی زندگی بسر کرنا شروع کی، اور حضرت شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر درویش ہو گئے،[3]

یہ معلوم نہیں کہ میر کا خاندان سنی تھا یا شیعہ، علی متقی سنی تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً تفضیلی تھے، ذکر میر میں ہے کہ "ایک بار علی متقی نے شیخ سے سوال کیا کہ "میں نے اپنے عقائد تو درست کر لیے ہیں، مگر حضور حاکم شام کے متعلق کیا فرماتے ہیں"، شیخ نے جواب دیا کہ "کہوں گا"، کچھ عرصہ کے بعد وہ آخر شب محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں

[1] ذکر میر ص ۳-۴ [2] ایضاً ص ۶۲ [3] ایضاً ص ۴-۵

تشریف لائے، علی متقی آفتابہ لے کر شیخ کو وضو کرانے لگے، شیخ نے فرمایا کہ "میں عمر بھر اس کا (حاکم شام کا) نام زبان پر نہیں لایا ہوں، اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں"، علی متقی نے بھی شیخ کے تتبع میں حاکم شام کا نام زبان پر لانے سے احتراز کیا،[1]

حاکم شام سے مراد یزید نہیں، جیسا کہ ڈاکٹر عبد الحق کا خیال ہے، بلکہ امیر معاویہ ہیں، کیونکہ یزید کے قابل لعنت ہونے کے تو سنی بھی قائل ہیں،

علی متقی میر کی تربیت میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے میر کی طبیعت میں فقر و قناعت اور خودداری و بے نیازی کی شان پیدا ہو گئی تھی، گو یہ شان ہر جگہ قائم نہ رہ سکی، وہ میر کو سمجھاتے تھے کہ "اے پسر عشق بورز، عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است"۔ الخ[2]۔ میر نے ان ہی خیالات کا اپنی مثنوی "شعلۂ عشق" میں اظہار کیا ہے،

میر کی تربیت اہل سنت کے ماحول میں ہوئی، انھیں صوفیوں سے عقیدت بھی تھی لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے شیعی مسلک اختیار کرنا شروع کیا، اور لکھنؤ پہنچکر تو غالی شیعہ ہو گئے،

ایک روز علی متقی گھر پہنچے اور ماما سے کہا "بہت بھوکا ہوں روٹی کا ایک ٹکڑا کھلا"، گھر میں اللہ کا نام تھا، ماما بازار سے آٹا اور روغن لے آئی، اور علی متقی کی بے صبری دیکھ کر بولی "یہ کیسی فقیری ہے، فقر میں ناز کو دخل نہیں"، علی متقی بغیر روٹی کھائے ایک درویش سے ملنے لاہور روانہ ہو گئے، لاہور میں اس درویش سے ملاقات ہوئی، مگر وہ ریاکار تھا، اس لیے بے لطفی ہو گئی، وہاں سے وہ دہلی پہنچے اور قمر الدین خاں ولد شیخ عبد العزیز عزت کے مہمان ہوئے، جو دیوان صوبہ اور عزیز قریب تھے، دہلی میں علی متقی مرجع خلائق بن گئے لیکن وہ امرا سے ملنے میں دریغ کرتے تھے، چنانچہ امیر الامرا صمصام الدولہ[3] نے قدیم تعلقات کی بنا پر لطف صحبت کی

[1] ذکر میر ص ۵-۶ [2] ایضاً [3] خان دوراں خواجہ محمد عاصم (۱۰۸۲ھ - ۱۱۵۱ھ) ولد خواجہ محمد قاسم

(باقی ص ۳۳۰ پر)

خواہش ظاہر کی جو مسموع نہ ہوئی، ہجوم خلق سے پریشان ہو کر نماز تہجد کے بعد شہر سے روانہ ہو گئے، اور بیانہ پہنچے جو اکبر آباد کے مضافات میں واقع ہے، اور ایک مسجد میں قیام کیا، یہیں ایک نوجوان (سید امان اللہ) سے ملاقات ہوئی جو ان کا گرویدہ ہو گیا، درویش کی نظر کیمیا اثر نے نوجوان کو مرغ بسمل اور بیخود کر دیا، پانی دم کر کے پلایا گیا تو وہ ہوش میں آیا، نوجوان نے خواہش ظاہر کی کہ علی متقی اس کے گھر پر قیام کریں، اصرار کے بعد علی متقی نوجوان کے گھر تشریف لے گئے اور کھانا تناول فرمایا، اتفاق سے اسی رات کو نوجوان کی شادی تھی، علی متقی کو بھی مدعو کیا گیا، مگر انھوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی اور شادی کی مذمت کرنے لگے، نوجوان رخصت ہو کر سسرال پہنچا، اور یہ "فقیر لاابالی" اپنے وطن آگرہ چلا آیا، نوجوان کو معلوم ہوا تو درویش کی تلاش میں روانہ ہوا، اور عروس کو گھر پر چھوڑ دیا، آخر آگرہ میں علی متقی سے ملاقات ہوئی اور نوجوان ان ہی کی خدمت میں رہنے لگا، علی متقی اس نوجوان کو "برادر عزیز" سمجھنے لگے، نوجوان کسب فیض سے تھوڑی مدت میں "فقیر کامل" ہو گیا، اور اس کی بیوی تپ دق میں مبتلا ہو کر مر گئی،[1]

یہ واقعہ غالباً ۱۱۴۳ھ کا ہے، اور میر کی عمر اس وقت سات برس کی تھی،[2]

سید امان اللہ نے میر کو اپنے آغوش تربیت میں لے لیا، اور میر بھی ان سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ انھیں حقیقی چچا سمجھنے لگے، میر ان ہی کے پاس سوتے اور کھاتے اور وہ جہاں جاتے میر بھی ان کے ساتھ جاتے، میر نے ان ہی سے قرآن پاک کا درس لیا، سید امان اللہ علی متقی سے دست بیعت ہو کر ان کے مرید خاص ہو گئے، انھیں درویشوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا، میر بھی ان کے ہمراہ رہتے، ان درویشوں کے نام یہ ہیں: احسان اللہ، بایزید، اسد اللہ، اسید امان اللہ

[1] ذکر میر ص ۸ تا ۱۹ [2] کیونکہ وہ ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے تھے،

نے علی متقی کی فرمائش سے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا، ایک روز علی متقی و امان اللہ قرآن پاک کا دور کر رہے تھے کہ اسد اللہ پہنچے جو علی متقی کے بڑے بھائی تھے، اور ان کی وفات کے متعلق پیشگوئی کی، امان اللہ بہت رنجیدہ ہوئے، اور بولے کہ میری زندگی تک ایسا نہیں ہو سکتا، یکم عید الفطر (۱۱۴۵ھ) کو امان اللہ کے سینہ میں سخت درد اٹھا، اور وہ بستر سے لگ گئے، ۲؍ عید کو علی الصباح موذن اذان دے رہا تھا کہ ان کی روح پرواز کر گئی، شہر کے باہر ایک گوشے میں ان کی لاش سپرد خاک کی گئی، علی متقی کو اس حادثہ کا سخت صدمہ ہوا، اور انھوں نے اپنا لقب "عزیز مردہ" رکھ لیا، یہ لقب تمام شہر میں مشہور ہو گیا، میر اس وقت دس سال کے تھے، اپنے منہ بولے چچا کے غم میں نڈھال ہو گئے، باپ نے سمجھا کہ "ماہ من نہ طفل ہالۂ الحمد للہ کہ وہ سالۂ چہ نگاہش افتادہ آخر درویش زادۂ۔ دل با قوی دارد خود را بجد اسپار شاد بزی و خوش بمان"[1]

ایک سال کے اندر ہی علی متقی نے بھی میر سے مفارقت کی، ان کی وفات کا حال بھی دلچسپ و مفید ہے، جمادی الآخر (۱۱۴۶ھ) میں میر علی متقی "برادر عزیز" (امان اللہ) کے بھانجے محمد باعث کی عیادت کو محلہ عالم گنج گئے، شدت کی گرمی تھی، شام کو گھر واپس آکر مسجد میں عشائ کی نماز ادا کی اور بستر پر لیٹ گئے، بخار آگیا، رات کا کھانا نہ کھایا، صبح کو اٹھے تو شدید تپ تھی، حکیم ابوالفتح کا علاج شروع ہوا، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، ایک ماہ کے بعد ۲۱ رجب کو حکیم نے دوا بھیجی تو مریض نے پیالہ کو زمین پر پٹک دیا، اور کہا کہ "میں تو پہلے ہی روز سمجھ گیا تھا کہ دوا فائدہ نہ کرے گی۔ میں تمھاری خاطر سے پی لیتا تھا، مجھے چھوڑ دو اور جاؤ" اس کے بعد علی متقی نے اپنے بڑے لڑکے حافظ محمد حسن کو بلا کر کہا کہ "میرے پاس تین سو جلد

[1] ذکر میر ص ۳۰ تا ۳۵

کتابوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کتابیں لے آؤ کہ میں تینوں بھائیوں پر تقسیم کردوں"۔ محمد حسن نے کہا کہ "مجھے علم کا شوق ہے اور بھائیوں کو کتابوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ وہ کتابوں کو برباد کردیں گے، بہتر ہے کہ میرے پاس امانت رکھدیں، آیندہ اختیار ہے"۔ علی متقی محمد حسن کی طبیعت سے واقف تھے، بہت خفا ہوئے، اور کتابیں ان ہی کے سپرد کردیں، اس گفتگو کے بعد وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "بازار کے بقالوں کے تین سو روپے میرے ذمہ باقی ہیں، جب تک یہ قرض ادا نہ ہوجائے میرے جنازے کو نہ اٹھانا"۔ میر نے عرض کی کہ کتابیں تو بھائی صاحب کو مل گئیں، گھر میں دوسری کوئی چیز نہیں جس سے قرض ادا ہو"۔ علی متقی یہ سنکر رونے لگے اور فرمایا کہ "خدا کارساز ہے پریشان نہ ہو، روپے راستے میں ہیں، تمھیں بہت جلد مل جائیں گے، میں چاہتا تھا کہ میرے سامنے یہ روپئے آجاتے، لیکن میرا وقت آگیا ہے، مجبور ہوں"۔ یہ کہکر انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت میر صرف گیارہ سال کے تھے، انکی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی، سر پر آسمان ٹوٹ پڑا، زار و قطار رونے لگے، سر کو پتھر سے مارا، زمین پر گر پڑے، برادر کلاں نے آنکھیں پھیر لیں تاکہ قرض خواہ انھیں نہ ستائیں، اور ادائے قرض کی ذمہ داری سے انکار کردیا، اور یہ بھی کہا کہ والد کی زندگی میں کسی کام میں میں نے دخل نہ دیا، اب ان کے سجادہ نشین جو ناز و نعمت سے پرورش پاچکے ہیں قرض ادا کریں"۔ میر یہ تلخ گفتگو سنکر غم و غصہ سے بیتاب ہوگئے، لیکن کمسنی کے باوجود ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، خدا کے بھروسہ پر بیٹھ گئے، بازار کے بنیے دو سو روپے اور لیکر آئے، اور منت سماجت کے ساتھ پیش کرنے لگے، لیکن باپ کی وصیت کے مطابق میر نے اس روپئے کو ٹھکرادیا، اتنے میں ان کے منہ بولے چچا کے ایک مرید جن کا نام آدم سید مکمل خاں تھا، پانچ سو روپے کی ہنڈی لیکر آئے، میر نے تین سو روپیے سے باپ کے قرض کو ادا کیا اور سو روپیے سے

تجہیز و تکفین کی اور باپ کی لاش کو ان کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔[1]

میر نے آسمان کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے جور و ستم جھیلے، لیکن کسی کے شرمندۂ احسان نہ ہوئے، پریشان ہوکر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو گھر پر اپنا قائم مقام بناکر شہر کے اطراف میں تلاش روزگار کرنے لگے، لیکن کوئی امید بر نہ آئی، مجبور ہوکر (۱۱۴۶ھ) میں دہلی پہنچے اور خواجہ باسط کی وساطت سے ان کے عم محترم امیر الامرا صمصام الدولہ (خواجہ محمد عاصم خاں دوران) کی خدمت میں حاضر ہوئے، امیر الامرا نے میر محمد علی (علی متقی) کی موت کا حال سن کر افسوس کا اظہار کیا اور میر کے حال پر عنایت فرمائی، ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر ہوا، میر نے عرض کی کہ "تحریری حکم نامہ عنایت ہو"، امیر الامرا نے جواب دیا کہ "وقت قلمدان نیست"، اس پر میر نے قہقہہ لگایا[2] اور سبب پوچھنے پر بولے کہ "وقت قلمدان نیست" نئی قسم کی عبارت ہے، اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار نہیں ہے یا دستخط کا وقت نہیں ہے تو ایک بات ہوتی، آپ جس کو حکم دیں گے قلمدان حاضر کردے گا، نواب متبسم ہوئے اور کہنے لگے کہ معقول بات ہے، قلمدان منگاکر حکمنامہ پر دستخط کرکے میر کے حوالہ کیا، یہ دستاویز لیکر میر رخصت ہوئے، یہ وظیفہ نادر شاہ کے محمد شاہ پر مسلط ہونے اور امیر الامرا کے اس جنگ میں مقتول ہونے تک جاری رہا، اس وظیفہ سے میر کی زندگی آرام سے بسر ہوتی تھی۔[3]

یہ جنگ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ م مطابق فروری ۱۷۳۹ء میں بمقام کرنال واقع ہوئی تھی، اس جنگ میں امیر الامرا ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ کو مجروح ہوئے اور دو تین دنوں کے بعد انتقال کرگئے، نادر شاہ ۹ مارچ ۱۷۳۹ء م ۳۰ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ روز جمعہ کو دہلی پہنچا تھا، ۱۱ مارچ م ۲ ذی الحجہ روز یکشنبہ کو قتل عام ہوا، ۵۷ دنوں کے قیام کے بعد ۵ مئی کو نادر شاہ فتوحات

۱؎ ذکر میر ص ۵۷ تا ۶۰۔ ۲؎ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ امیر الامرا کے سامنے میر اس بدتمیزی سے گفتگو نہیں کرسکتے تھے۔ ۳؎ ذکر میر ص ۶۲ - ۶۳

کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوگیا،

امیر الامرا کے مرنے کے بعد میر کو پھر کوئی سہارا نہ رہا۔ مجبور ہو کر (۱۱۵۲ھ میں) وہ پھر دہلی گئے، اور سوتیلے ماموں خان آرزو کے ہاں ٹھہرے۔ خان آرزو کا سلوک میر کے ساتھ اچھا نہ تھا، میر ان کے پاس بہت کم رہتے، زیادہ وقت شہر کے لوگوں سے کتابیں پڑھنے میں گذارتے، حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو لکھ بھیجا تھا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است، زینہار بہ تربیت او نباید پرداخت و در پردۂ دوستی کارش باید ساخت"۔ جب ملاقات ہوتی تو وہ میر کو سخت سست کہتے، طعن و تشنیع کے تیر چلاتے۔ میر کی برائی چاہتے اور دشمنی سے پیش آتے، افلاس سے میر کا برا حال تھا، وہ خان آرزو کے ایک روپئے سے بھی کبھی واحد و شاہد نہ ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے رنج و غم نے جنون کی شکل اختیار کر لی،[۱] وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے، چاند کو دیکھکر ان کی عجیب حالت ہو جاتی تھی، چاند میں انھیں ایک "ماہ پیکر" نظر آتا تھا، وہ جب ان کی طرف دیکھتا ان پر بیخودی طاری ہو جاتی تھی، جدھر نگاہ اٹھتی وہی صورت نظر آتی تھی، چار مہینوں تک یہ مجنونانہ کیفیت قائم رہی، لوگ ان سے دور بھاگتے تھے، یہ مارے مارے پھرتے تھے اور ہاتھوں میں پتھر کے ٹکڑے لیے رہتے تھے، بہار آئی تو "داغ سودا سیاہ" ہوگیا، ہر وقت وہی صورت سامنے رہتی تھی، اور اس کی زلف مشکیں کا سودا سر میں رہتا تھا، یہاں تک کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، اور وہ کمرے میں قید کر دیے گئے، میر کے والد کے مرید فخر الدین خاں کی بیوی نے جن سے قرابت بھی تھی، بہت روپئے خرچ کر کے علاج کرایا، عاملوں نے جھاڑ پھونک کیا، طبیبوں نے دوائیں دیں، آخر فائدہ ہوا، وہ کیفیت جاتی رہی، چاند میں جو تصویر نظر آتی تھی غائب ہوگئی، نیند بھی آنے لگی، یہاں تک کہ کامل صحت ہوگئی، اب میر تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے،

۱؎ اپنے جنون کی کیفیت کو میر نے مثنوی "خواب و خیال" میں خوبی سے بیان کیا ہے،

اور مکتوبات کا مطالعہ شروع کیا،[۱]

ایک روز میر بازار میں کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ میر جعفر عظیم آبادی[۲] سے ملاقات ہو گئی، انھوں نے میر کا شوق مطالعہ دیکھکر پڑھانے کی خواہش ظاہر کی، میر نے مجبوری بیان کی کہ "میں تنگدست ہوں، آپ کی خدمت کیونکر کر سکتا ہوں، مگر آپ زحمت تدریس گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہوگی"۔ بہرحال محض ناشتہ کے عوض میں میر جعفر نے میر کو پڑھانا شروع کیا، یکایک ان کے وطن سے خط آیا اور وہ عظیم آباد روانہ ہوگئے، کچھ دنوں کے بعد سید سعادت علی[۳] سعادت امروہوی سے ملے، انھوں نے میر کو شاعری کی ترغیب دی، میر نے "اردوے معلی" میں شعر کہنا شروع کیا، اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ شاعروں میں مستند قرار پائے اور ان کی غزلیں شہر میں مشہور ہوگئیں،

ایک روز خان آرزو نے میر کو کھانے پر بلایا، میر ان کی تلخ بیانی سن کر بہت "بے مزہ" ہوئے اور دستر خوان سے اٹھکر جامع مسجد کی راہ لی، راستہ بھول کر حوض قاضی پر پہنچے، جو وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس واقع تھا، اس آبگیرے انھوں نے پانی پیا، وہیں ایک شخص علیم اللہ سے ملاقات ہوئی جنھوں نے کہا کہ "رعایت خاں پسر عظیم اللہ خاں نبیرۂ[۴] اعتماد الدولہ قمر الدین خاں آپ کا کلام سن کر آپ کی ملاقات کے خواہش مند ہیں"۔ میر رعایت خاں سے ملے، وہ میر سے اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور انھیں اپنا رفیق بنا لیا، اب میر کی تنگدستی

۱؎ ذکر میر ص ۶۳ - ۶۶ ۲؎ میر جعفر پٹنہ کے ایک ذی علم بزرگ تھے، میر نے ان سے فارسی یا عربی (یا دونوں) پڑھی تھی، لیکن یہ خیال کہ میر شاعری میں ان کے شاگرد تھے، گمراہ کن ہے ۳؎ میر نے نکات الشعراء میں ان کا ذکر کیا ہے،

۴؎ عالم شیخ ولد اللہ داد خاں ولد عبدالرحمن شیخ عزیزان کے دو لڑکے تھے، خواجہ عابد اور میر بہاء الدین، اعتماد الدولہ قمر الدین خاں ولد میر محمد امین میر بہاء الدین کے پوتے تھے، اور خان دوراں میر قمر الدین چین قلیچ خان نظام الملک

دور ہوئی اور وہ آرام سے رہنے لگے،[1]

اس کتاب میں میر نے خان آرزو کی سخت شکایت کی ہے اور جلے دل کے پھپھولے توڑے ہیں، لیکن نکات الشعرا میں ان کے علم و فضل کی بہت تعریف کی ہے، اور شکایت کا ایک حرف بھی زبان قلم پر نہیں لائے ہیں، فرماتے ہیں "شاعر زبردست، نادر سخن، عالم فاضل، تا حال بچو ایشان بہ ہندوستان جنت نشان ہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود، شہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق، صاحب تصنیفات دہ پانزدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات، حاصل کمالات اوشان از حیزۂ بیان بیرون است، ہمہ اوستادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوارند۔" (نکات ص ۳) خود میر بھی اپنے کو خان آرزو کا شاگرد تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ مرزا معز فطرت موسوی خاں کے ترجمے میں فرماتے ہیں کہ "احوال او من و عن در تذکرۂ سراج الدین علی خان صاحب کہ استاد و پیر و مرشد بندہ است مسطور" (نکات ص ۴) ڈاکٹر عبدالحق کا یہ خیال کہ خان آرزو میر کے استاد نہ تھے صحیح نہیں، میر کے اقبال کے بعد کسی شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، میر نے خان آرزو سے یقیناً استفادہ کیا تھا، اگر شاعری میں اصلاح نہ بھی لی ہو تو بھی ان سے عربی فارسی وغیرہ ضرور پڑھی ہوگی، ہاں یہ بات البتہ حیرت انگیز ہے کہ میر کے بیانات میں اختلاف کیوں ہے، یعنی ذکر میر میں خدمت ہی مذمت ہے اور نکات الشعرا میں تعریف ہی تعریف، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی توجیہ کی ہے، جو قرین قیاس ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ میر نے خان آرزو کی تنقیص و تعریض میں مبالغہ آرائی کی ہے۔

میر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ درباداری سے گریز کرتے تھے، لیکن ذکر میر کے اوراق شاہد

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۵) آصف جاہ آصف (۱۰۸۲ھ۔ ۱۱۶۱ھ) خواجہ عابد کے پوتے تھے، عظیم اللہ خاں اعتماد الدولہ کے یزنہ (بہنوئی) تھے۔ [1] ذکر میر ص ۶۶ تا ۶۸

ہیں کہ وہ متعدد امرا سے وابستہ رہے، مثلاً امیر الامرا صمصام الدولہ (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے)، رعایت خاں ولد عظیم اللہ خاں، نواب بہادر جاوید خاں خواجہ سرا، مہا نرائن دیوان رحم جنگ کشور، راجہ ناگر مل، بہادر سنگھ پسر لالہ رادھا کشن، اعظم خاں پسر اعظم خاں کلاں، نواب عماد الملک، شاہ عالم بادشاہ، ابو القاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر، نواب آصف الدولہ وزیر اعظم وغیرہ،

احمد شاہ ابدالی (درانی) نے لاہور پر چڑھائی کی، وہاں کے صوبہ دار شاہ نواز خاں پسر زکریا خاں نے راہ فرار اختیار کی، وزیر، صفدر جنگ اور ایشر سنگھ پسر راجہ جے سنگھ[1] زمیندار کلاں شہزادہ احمد شاہ (پسر محمد شاہ بادشاہ) کو ساتھ لے کر مقابلے کو نکلے، جنگ شروع ہوئی، سرہند کی طرف سے ایک گولہ آیا جس سے وزیر مر گئے، ایشر سنگھ فرار ہوگیا، لیکن آخر کار افغانوں کی فوج شکست کھا کر بھاگی، معین الملک پسر وزیر صوبہ دار لاہور مقرر ہوئے، اس سفر میں میر رعایت خاں کے ہمراہ تھے، اور ان کی خدمت کرتے تھے، رعایت خاں صفدر جنگ کے ساتھ دہلی کو واپس ہوئے، جب یہ قافلہ پانی پت کے قریب پہنچا تو خبر ملی کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا، صفدر جنگ نے "چتر و تخت" احمد شاہ کو پیش کیا اور انھیں تخت پر بٹھایا اور کر و فر کے ساتھ دہلی پہنچے، یہاں محمد شاہ کے خواجہ سرا جاوید خاں نے نواب بہادر کا لقب اختیار کر کے سلطنت کے تمام اختیارات حاصل کر لیے،[2]

یہ واقعات ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء کے ہیں، یہ محمد شاہ کا عہد تھا، افغانوں کی شکست کا مادۂ تاریخ "آفت رفت" ہے جس سے ۱۱۶۱ھ نکلتا ہے، میر صابر لاہوری نے کہا ہے

[1] راجۂ امبیر جو بعد کو گورنر مالوا ہوا، یہی چورامن جاٹ کے مقابلہ کو بھیجا گیا تھا، اسی نے مغلوں کی سلطنت پر بھی حملہ کیا تھا مگر ناکام رہا۔ [2] ذکر میر ص ۶۸ - ۶۹

محمد شاہ کا اب بخت جاگا — ندا ہاتف نے دی "افغان بھاگا" — ۱۱۶۱ھ

وزیر مقتول سے مراد اعتماد الدولہ قمر الدین خاں ہیں، نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ (متوفی ۱۱۶۷ھ) نواب شجاع الدولہ کے والد اور نواب آصف الدولہ کے دادا تھے۔

جب نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں وفات پائی تو منصب وزارت صفدر جنگ کو ملا، اور سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی گری کے عہدے پر سرفراز ہوئے، آخر الذکر نے راجہ بخت سنگھ کو صوبۂ اجمیر کی نیابت دیکر اس کے بڑے بھائی ابھے سنگھ مہاراجۂ جودھ پور کے مقابلہ کو روانہ کیا، راجۂ مذکور رعایت خاں کو فوج کا سردار بنا کر ساتھ لیتا گیا، قصبۂ سامر میں جو اجمیر سے بیس کوس پر واقع ہے، معرکۂ کارزار گرم ہوا، دونوں فوجیں مقابل ہوئیں اور توپیں سر ہونے لگیں، آخر اس دیار کے رئیس ملہار راؤ کی مداخلت سے صلح ہوگئی، میر بھی اس جنگ میں رعایت خاں کے ہمراہ تھے، صلح کے بعد انھوں نے اس سفر سے یہ فائدہ اٹھایا کہ "حصول سعادت" کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی "درگاہ فلک اشتباہ" کی زیارت کی اور وہاں کی "سیر" کے بعد دہلی واپس آئے[1]

نظام الملک میر قمر الدین خاں آصف جاہ (۱۰۸۲ھ - ۱۱۶۱ھ) ۲۰ فروری ۱۷۲۲ء م ۱۱۳۴ھ میں وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے، جنوری ۱۷۲۴ء م ۱۱۳۶ھ میں مستعفی ہو گئے تو ان کے بڑے صاحبزادے غازی الدین خاں فیروز جنگ نائب وزیر مقرر ہوئے، ۲۲ جولائی ۱۷۲۴ء کو غازی الدین خاں علیحدہ کیے گئے اور اعتماد الدولہ میر قمر الدین خاں وزیر اعظم ہو گئے۔ نظام الملک شاعر بھی تھے، آصف تخلص تھا، ان کا ذکر عقد ثریا (تذکرۂ مصحفی) میں ہے۔ سادات خاں (متوفی ۱۱۳۱ھ) کے صاحبزادے صلابت خاں عرف سادات خاں

[1] ذکر میر ص ۶۹

ذوالفقار جنگ تھے، ان کی صاحبزادی فخر النساء بیگم فرخ سیر سے بیاہی گئی تھیں، ۱۱۶۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، راجہ ابھے سنگھ اور راجہ بخت سنگھ، راجہ اجیت سنگھ مہاراجہ جودھ پور کے لڑکے تھے، ۱۱۲۷ھ م ۱۷۱۵ء میں رائے اندر کنور دختر راجہ اجیت سنگھ کی شادی بڑے تزک و احتشام سے فرخ سیر کے ساتھ ہوئی، شائستہ خاں نے ایک لاکھ اشرفی دین مہر کے عوض میں عقد نکاح پڑھایا تھا، فرخ سیر کے عبرت انگیز قتل کے بعد اندر کنور کو قطب الملک عبداللہ خاں نے تمام مال و اسباب کے ساتھ اس کے باپ کے پاس بھیجدیا، کچھ عرصہ کے بعد راجہ اجیت سنگھ اپنے چھوٹے لڑکے بخت سنگھ کی بیوی سے محبت کرنے لگا، راجہ بخت سنگھ اس غیرت کو گوارا نہ کر سکا، اور باپ کو شراب کے نشہ میں مخمور پا کر بغض و حسد کے جوش میں اس کا کام تمام کر دیا، ۷ رجون ۱۷۲۴ء کو اس کی لاش نذر آتش کی گئی اور اس کے ساتھ اس کی چوراسی بیویاں اور رشتہ دار عورتیں بھی ستی ہو گئیں، ۲۷ جولائی کو راجہ ابھے سنگھ صمصام الدولہ خواجہ عاصم خان دوراں کی وساطت سے راجۂ راجیشور کا خطاب حاصل کر کے جودھ پور کا مہاراجہ ہو گیا[1]

رعایت خاں اور راجہ بخت سنگھ میں کچھ جھگڑا ہوا، اور صحبت بے لطف ہو گئی، رعایت خاں نے میر کو راجہ بخت سنگھ کے پاس عذر خواہی کے لیے بھیجا، ان کی طرف سے میر نے جا کر قسم کھائی کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، لیکن راجہ کو یقین نہ ہوا، رعایت خاں دہلی واپس آکر گھر بیٹھ رہے، ایک روز چاندنی رات میں مہتابی پر بیٹھے ہوئے رعایت خاں قوال بچہ کا گانا سن رہے تھے، میر پر ان کی نظر پڑی تو کہا کہ "میر صاحب اپنے ریختہ کے دو تین شعر اس کو یاد کرا دیجئے کہ وہ ساز پر گا سکے۔" میر نے جواب دیا کہ "یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا"، رعایت خاں نے اپنے سر کی

[1] Later moghul by Irvin

قسم کی تو مجبور ہو کر میر نے اپنی غزل کے پانچ اشعار اس کو یاد کرا دیے، لیکن میر کی طبع نازک پر یہ بات بہت گراں گذری، دو تین دنوں کے بعد میر اپنے گھر بیٹھ گئے اور نوکری چھوڑ دی، خان موصوف نے بہت بلایا مگر میر نہ گئے، رعایت خاں کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ میر یوں ناکام رہیں، اس لیے ان کے بھائی میر محمد رضی کو میر کی رفاقت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک گھوڑا عنایت کیا اور انھیں نوکر رکھ لیا، کچھ عرصہ کے بعد میر نے ملاقات کی تو انھوں نے بہت عذر کیا، میر نے جواب دیا "گذشتہ را صلوات"۔[1]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کس قدر نازک مزاج واقع ہوئے تھے، اور آزاد نے آب حیات میں جوان کی نازک مزاجی کی تصویر کھینچی ہے وہ بہت کچھ اصلیت رکھتی ہے،

(باقی)

---

[1] ذکر میر ص ۷۰-۷۱

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج) ضخامت کتاب ۸۰۵ صفحات، تقطیع بڑی، قیمت ۷ روپئے ۵۰ نئے پیسے، ملنے کا پتہ: کتابستان، الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے، آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں ان کے متعلق سرخیاں قائم کی گئی ہیں، اور چند چند متحد المضامین اشعار، ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں، مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بکثرت سرخیاں ہیں، اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ ہے تو وہ بھی درج کر دیا گیا ہے، اساتذہ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں، اردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش و دلفریب اضافہ ہے، اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اسلامی فلسفہ اور دینیات کا اثر

یورپی فلسفہ اور دینیات پر

مترجمہ سید مبارز الدین رفعت، لکچرر گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گلبرگہ

[ذیل کا مقالہ پروفیسر آلفرڈ گلیوم پرنسپل کل ہام کالج لندن کی مشہور کتاب "لگیسی آف اسلام" کے مقالہ "فلاسفی اینڈ تھیالوجی" کا ترجمہ ہے۔]

مسلم اقوام میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ خلافت کے سنہرے دور میں فلسفہ کے جو عالمگیر نظام پروان چڑھے تھے، وہ عربی اور اسلامی تھے، اور یہ کہ اسلامی علمی ادارے یورپی جامعات کے پیش رو ہیں، اور یہ جامعات ان ہی اداروں کے نمونے پر مبنی ہیں، یہ نقطۂ نظر جس میں یہ دعویٰ چھپا ہوا ہے کہ اسلام کی حیثیت گویا والدین کی ہے، جنھوں نے یورپی تمدن کو جنم دیا اور اس کو پروان چڑھایا، صرف تبلیغی ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ نقطۂ نظر دلائل کے ساتھ اور بغیر دلائل کے ایسے مسلم علما، کی تحریروں تک میں ملتا ہے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے اسلامی اداروں کے ارتقا، کی تاریخ کے مطالعہ کے سلسلہ میں اہم تحقیقیں کی ہیں، مغربی ادب میں بھی اکثر "عربی فلسفے" کا ذکر پڑھنے میں آتا ہے، "عربی فلسفہ" کے بارے میں بعض مغربی مصنفوں کا تو یہی خیال ہے کہ یہ قدما، کی آرا، کا ایک ایسا معجون مرکب ہے جس میں ہر طرح کی بے جوڑ چیزیں ملا کر جوش دیدی گئی ہیں، ان کے نزدیک "عربی فلسفہ" نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے، ان کا

کہتا ہے کہ عربی بولنے والی قوموں نے بس اتنا ہی کیا ہے کہ شامی نصرانیوں اور حران کے بت پرست شایستہ طبقے میں جو یونانی فلسفہ مقبول تھا، اسی کو اپنا لیا اور اس میں ایران اور ہندوستان سے لیے ہوئے بعض عناصر کو جوڑ دیا،

حقیقت یہ ہے کہ عربی فلسفہ کے ڈھانچے، اس کے حدود اور اس کی نوعیت کا سراغ اب ان مملکتوں کے تمدنوں میں لگایا جا سکتا ہے، جن کو عربوں نے فتح کیا، اور جنکے نظاموں پر یونانی فلسفہ کا زبردست اثر تھا، اس زمانہ میں خواہ کچھ کہا گیا ہو، مگر قدیم مسلم عالموں کو عربی فلسفہ کی حقیقت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی، جاحظ بصری (متوفی ۸۶۹ء) ایک نہایت وسیع النظر اور جامع العلوم فاضل تھا، اس کی تحریروں سے آگے چل کر مسلم اسپین بہت زیادہ متاثر ہوا، جاحظ نے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ اس کے ہم مذہب اہل یونان کی ذہنی کاوشوں کے کس درجہ منت پذیر ہیں، چنانچہ وہ کہتا ہے "کیا ہمارے پاس قدما، کی ایسی کتابیں نہیں ہیں جن میں ان کی حیرت انگیز دانش و حکمت ثبت ہے، اور جن میں تاریخ کے بامعنی سبق اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ ماضی ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے، کیا ہمیں ان تجربوں کی دولت پر دسترس نہیں ؟ ان تجربوں کے نتائج سے اگر ہم محروم ہی رہتے تو ہماری حکمت کا خزانہ بہت ہی حقیر ہوتا، اور حقیقی ژرف نگاہی پیدا کرنے کے ذرائع ہمارے پاس بہت ہی محدود ہوتے" مسلمان فلسفی اور علماے کلام خود بھی بڑی حد تک اپنے نظریات کے ماخذ چھپانے کی کوشش نہیں کرتے، کوئی ادبی چال ان قدامت پرستوں کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی، جو قرآن اور احادیث نبوی سے اپنے آپ کو وابستہ کیے ہوئے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب جن جن ذہنی کاوشوں سے ناآشنا تھے، ان سب پر سب سے زیادہ اعتراض یہی ہوتا تھا کہ بیرونی ملکوں سے لی ہوئی بدعتیں ہیں، فلسفہ کو

یہ لوگ کفر آمیز حکمت' کہتے تھے، کتابوں کے عنوان رکھے جاتے تھے: عرض المخازی الاغوین ومنهل للحکم الدینیة'، 'کتاب البرهان الحسی علی تنقید الفلسفة فی القرآن'۔ یہ عنوان اپنی داستان آپ سنا رہے ہیں، ایک قصہ بھی مشہور ہے کہ ایک نامور فلسفی نے بستر مرگ پر اپنے نظریوں سے توبہ کی، اس کے آخری الفاظ یہی تھے "صدق اللہ العظیم، وکذب ابن سینا" !

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ عربوں نے قدیم مفکروں کی فکر پر اضافے کر کے انسانی علم کو جو عطیہ دیا ہے وہ کچھ ایسا قابل لحاظ نہیں، اس کے باوجود خواہ کوئی کتنے ہی مدلل طریقے پر یہ ثابت کرے کہ اسلامی تمدن کی میراث بہت تھوڑی ہے، یا اس نے وہی ورثہ ہیں دیا ہے جو اسے ورثہ میں ملا تھا، یہ بات غیر منصفانہ سی معلوم ہوتی ہے کہ اس تمدن کو فلسفیانہ فکر کی اس مخصوص ترکیب سے محروم کر دیا جائے، جسے اس کے عالموں نے اپنے نظام فکر کی حیثیت سے قبول کیا، اور یہ بھی قطعی انصاف سے بعید ہو گا کہ اگر علم برائے علم کے لیے اس جوش خرو کو گھٹا کر دکھایا جائے، جس کا مظاہرہ وسیع اسلامی مملکت کے پورے طول و عرض میں بے شمار عالموں نے کیا ہے، مستشرقین کے نزدیک[1] عربی فلسفہ ایک واضح معنی کا حامل ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایک خالص عربی النسل فلسفی الکندی نے فلسفیانہ مسائل پر عبور کے لیے ناموری حاصل کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ارسطاطالیسی اور نوافلاطونی تصورات کے عجیب اور اکثر ناقابل تطبیق امتزاج کو جسے بڑے سے بڑے مسلم فلسفی نے کائنات کی قابل قبول توجیہ مانا ہے، وہ صرف عربوں ہی کا حصہ ہے، یہ کوئی اسلامی چیز

---

[1] اور دوسروں کے یہاں بھی: ملاحظہ ہو کیچر (Keicher) کی جرمن کتاب "ریمنڈ لل اور عربی فلسفے کے سلسلہ میں اس کا موقف" Raymundus Lulls und seme shllung zur are

تھی، اس کے بڑے بڑے شارح برائے نام مسلمان تھے یا وہ لوگ تھے جنھیں خود اپنے زندیق ہونے کا اعتراف تھا، انھوں نے اپنے ان تصورات کے لیے قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، بلکہ جان تک دیدی،

مغلوں کی طرح عرب وحشی نہ تھے، مغلوں نے اپنی بربریت سے مشرق میں علم کی شمع ایسی بجھائی کہ پھر روشن نہ ہوسکی، اس وحشت وبربریت سے کتب خانے اور اس کی ادبی روایتیں ایسی غارت ہوئیں کہ آیندہ بھی یہاں علم کی شمع کے روشن ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی، اگر عرب بھی مغلوں کی طرح وحشی ہوتے تو یورپ کی نشأۃ ثانیہ ایک سو سال سے بھی زیادہ پیچھے پڑجاتی، چھاپے کی ایجاد سے پہلے طالب علم کی زندگی ہمیشہ مشکلات اور موانعات سے بھری ہوئی تھی، مشرق اور مغرب میں مسلم جامعات کے قائم ہونے تک بلکہ اس کے بعد بھی بہت سے طالب علم معمول کے مطابق استاد کی تلاش میں ہزار ہزار میل سے بھی زیادہ دور دراز مقامات کا سفر کرتے تھے، نوجوان طلبہ اپنے استاد کی قدم بوسی کے لیے اندلس سے مکہ یا مراکش سے بغداد تک کا سفر اختیار کرتے، اور وہ اپنے گھروں سے عموماً تہی دست ہی نکلا کرتے تھے،

یہاں مسلم جامعات کی ابتدا کے بارے میں کچھ کہنا بے محل نہ ہوگا، بغداد کا مشہور مدرسۂ نظامیہ پہلی مسلم جامعہ تھی جس کی بنیاد عمر خیام کے دوست اور ترک بادشاہ الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک نے ۴۵۷ھ میں رکھی تھی، یہ نارمنوں کے انگلستان فتح کرنے سے ایک سال پہلے کی بات ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں دوسری جامعات بھی نیشاپور، دمشق، بیت المقدس، قاہرہ، اسکندریہ اور دوسرے مقامات پر قائم ہوگئیں، یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ یہ جامعات اکثر وبیشتر ایسے مقامات پر قائم ہوگئیں جو طلوع اسلام سے صدیوں پہلے سے علم وحکمت کے لیے مشہور چلے آرہے تھے، یورپ میں دسویں صدی

کے لگ بھگ سالرنو (Salerno) علم طب کی درسگاہ کی حیثیت سے مشہور ہوچکا تھا،[۱] اگر یہ مدرسہ سچ مچ قدیم یونانی دبستان طب کا احیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوبی اطالیہ گیارہویں صدی تک بازنطینی سلطنت کا ایک جزء تھا، نارمنوں کی فتح کے بعد بھی یہ مقام ایک ایسی کثیر آبادی کا وطن رہا جس کی زبان یونانی تھی، پھر ایک طرف صقلیہ کے نارمن فاتحوں نے عربی علوم کی پوری پوری سرپرستی کی، اور اسلامی رسوم کو مکمل طور پر اختیار کیا، اس سے یہ نتیجہ نکالے بغیر رہا نہیں جاسکتا کہ اس مدرسہ پر عربی طب کا گہرا اثر تھا، یہ اثر خواہ تخلیقی نہ ہو، لیکن پچھلی روایتوں کو قائم وبرقرار رکھنے والا ضرور تھا،[۲] اور اکثر مسلم آبادی مسلمان طبیبوں ہی سے اپنا علاج کراتی تھی، اور قدیم ترین مصنفوں کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ عرب طبیبوں کی تحریروں سے ناآشنا نہیں تھے۔

سالرنو ایک سیدھا سادا طبی مدرسہ تھا، یہ کوئی جامعہ نہ تھی، بلوگنا (Bologno) پیرس، مانٹ پلیر اور آکسفورڈ کی نصرانی جامعات دسویں صدی میں قائم ہوئیں، یورپ میں پہلی عربی جامعہ جس کی بنیاد اسلامی علوم پر رکھی گئی تھی، وہ مسلمانوں کی قائم کی ہوئی نہ تھی، بہت دنوں بعد وجود میں آئی، الفانسوے دانا (۱۲۵۲ء - ۱۲۸۴ء) نے ابوبکر الرقوطی نامی اپنے عہد کے ایک بہت بڑے عالم کی خدمات حاصل کیں، اور ان کے لیے ایک مدرسہ بنوایا جہاں وہ نصرانیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کو تمام علوم کی تعلیم دیتے تھے،

اسلامی جامعات میں سب سے شاندار جامعہ مستنصریہ تھی، جو بغداد میں ۱۲۳۴ء کے قریب قائم کی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ظاہری شان وشوکت، پرشکوہ زیب وزینت

---

۱ دیکھیے رشیڈل (Rashdall) کی کتاب "قرون وسطی میں یورپی جامعات" جلد اول باب اول، کیمبرج میڈیول ہسٹری باب ۶، ص ۵۶۰۔ ۲ گل یوم لی بان (دوم) نے اپنی رعیت کو جس کی اکثریت مسلم تھی، حکم دیا،

وسعت اور اوقاف کی بے شمار دولت کے لحاظ سے مدرسہ مستنصریہ اسلامی دنیا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، اس میں فقہ کے چار الگ الگ اسکول تھے جن میں سنی فقہ کے چاروں مکتبوں (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کی تعلیم دیجاتی تھی، ہر مدرسہ کا صدر ایک معلم ہوتا تھا جس کی نگرانی میں فقہ کے پچھتر طالب علم ہوتے تھے، ان سب کی تعلیم و تربیت کا انتظام اس کے ذمہ ہوتا تھا، فقہ کے چاروں معلموں کو ہر مہینے تنخواہ ملتی تھی اور فقہ کے تین سو طالب علموں کو ہر مہینے سونے کا ایک دینار ملا کرتا تھا، اس کے سوا مدرسہ کا وسیع مطبخ اسکے مقیم طالبعلموں کو روزانہ روٹی اور گوشت مہیا کرتا تھا، ابن فرات کے بیان کے مطابق مستنصریہ میں ایک کتب خانہ بھی تھا... جس میں مختلف علوم و فنون پر نایاب اور نادر کتابیں جمع کی گئی تھیں، ان کتابوں کو اس ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ طلبہ کو ان سے استفادہ میں سہولت ہو، جو شخص ان کتابوں کی نقل لینا چاہتا اس کو مدرسہ کی طرف سے کاغذ اور قلم مہیا کیا جاتا تھا، اس کا بھی ذکر ملتا ہے کہ طالب علموں کے لیے چراغوں اور مدرسہ کو روشن رکھنے کے لیے زیتون کا تیل بھی ملتا تھا، اس طرح پینے کے پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کے مخزن بنائے گئے تھے، مدرسہ میں داخل ہوتے ہی جو بڑا ہال تھا اس میں ایک گھڑی رکھی تھی، جو ایک طرح کی پن گھڑی ہوگی، جو نماز کے معینہ اوقات اور دن رات کے گھنٹے گزرنے کا اعلان کرتی تھی، مدرسہ میں ایک حمام تھا...... یہ حمام خاص طور پر طالب علموں کے لیے بنایا گیا تھا، مدرسہ کے متعلق ایک دواخانہ بھی تھا، اس میں ایک طبیب متعین تھا جس کا کام ہر صبح دواخانہ میں حاضر رہ کر مریضوں کے لیے دوائیں تجویز کرنا تھا، مدرسہ میں بڑے بڑے گودام تھے جن میں کھانے پینے کی ہر طرح کی چیزیں اور دوائیں ذخیرہ کی جاتی تھیں،[۱] اور

[۱] بغداد عباسی خلافت کے دنوں میں" مصنفہ لی اسٹرینج، آکسفورڈ ص ۲۶۷، حاشیہ

یہ سب باتیں تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل کی ہیں،

تیرھویں صدی عیسوی میں ذہنی ترقی کی تحریکوں کی ابتدا کس طرح ہوئی، اسکا حال بہت ہی مبہم ہے، اپنی موجودہ معلومات کی بنیاد پر ہم یہاں محتاط طور پر اسپین کے مسلمان عالموں کی عظیم الشان خدمات کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، یورپ کی نصرانی جامعات پر اسپین کے مسلمانوں کے نظام تعلیم سے کہیں زیادہ لوگوں کو تعلیم دینے کے سلسلہ میں ان علما، کی خدمات کا اثر پڑا ہے، یورپ کی نصرانی جامعات بے شبہہ مشرقی جامعات سے عمر میں چھوٹی ہیں، اور قرون وسطی کے عالموں کی تصدیق اس نظریے کی پوری پوری تائید کرتی ہے کہ اسلامی علوم ان کے مطالعہ کے لیے کافی سامان مہیا کرتے تھے، ان میں سے بہت سے عالموں کا ذکر "ورثۂ اسرائیل" اور خود اس کتاب کے مختلف ابواب میں آچکا ہے، جان آف سالسبری اپنے قارئین کو اہل اسپین اور ان لوگوں کی خدمات یاد دلاتا ہے جو افریقہ اور اسلامی مشرق سے ربط رکھتے تھے[۱]، راجر بیکن (۱۲۱۵ء - ۱۲۹۲ء) نے لاطینی میں لکھا ہے" فلسفہ عربی سے استمداد کرتا ہے، اس لیے لاطینی دنیا کتب مقدسہ کو نہیں سمجھ پاتی، سوائے اس صورت کے کہ وہ اس زبان کو سیکھ لے، جس سے یہ فلسفہ منتقل ہوا ہے"، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون عرب مصنفین اس بیان کے صحیح صحیح مصداق ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان ابتدائی صدیوں کے سیاح یہ نہیں بتاتے کہ وہ اپنے ساتھ اسلامی سیادت کے زیر نگین یا مسلمانوں سے متاثر ملکوں سے کیا لیکر لوٹے، دسویں اور گیارھویں صدی میں مسلمانوں میں جن علوم کا رواج تھا اور گیارھویں اور بارھویں صدی میں نصرانی طالب علم جو علوم پڑھتے تھے، ان کے مقابلہ سے اس بات

[۱] ملاحظہ ہو 17.6 *Metalogicus*، اس حوالہ کے لیے میں پروفیسر کلمنٹ سی۔ جے۔ ویب کا ممنون ہوں،

کا پتہ لگ جائیگا کہ مشرقی اور مغربی جامعات میں اس سے کہیں زیادہ ربط ہو، جتنا ابتک خیال کیا جاتا ہے، لیکن اسکا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ پڑھنے کا باقاعدہ طریقہ استاد و شاگرد کا رشتہ، معاوضہ، اوقات کا مسئلہ، نظم و ضبط کا قیام، طیلسان کا عطا کرنا یا تدریس کی سند دینا، اور جامعاتی زندگی کی بشمار اصطلاحات وغیرہ ناگزیر طور پر کم و بیش وہی ہوں گی، خواہ تعلیم کا مرکز بغداد ہو کر آکسفورڈ، اسلیے جب تک اس نسبی تعلق کے بارے میں قطعی ثبوت نہ مل جائے اس وقت تک یہ کہنا کہ ادارے کی حیثیت سے نصرانی جامعات اسلامی نمونے پر قائم کی گئی ہیں، غلط بات ہوگی، اگرچہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، جیسے مسلمان عالم کا استاد کے نام اور اس کی سند سے ایک خاص متن کے پڑھانے یا دہرانے کی اجازت یا سند عطا کرنا، ایسا ہی رواج قرون وسطی کی "سند تدریس" (Licentia docendi) کی صورت میں ملتا ہے، جو طیلسان کی قدیم ترین صورت ہے، [1] دوسری طرف یہ اصول کہ کوئی شخص اس وقت تک معلم نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ایک اچھی خاصی مدت تک کسی مستند عالم کے آگے زانوے تلمذ تہ نہ کرچکا ہو، اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کہیں اور نظیر ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں، اشتراک کے دوسرے سطحی نقاط میں پردیسیوں کے بڑے بڑے گروہوں کی موجودگی بھی ہے جو جامعات میں اقوام کی حیثیت سے اپنی تنظیمیں قائم کرتے تھے۔ اس طرح یورپ کا یہ قدیم رواج بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ طالب علموں سے کسی قسم کی اجرت لیے بغیر مفت تعلیم دیجاتی تھی، اجرت کے بغیر طالب علم کے ہاتھ میں علم کی مشعل دینے کا فیاضانہ دستور قاہرہ کی عظیم الشان جامعہ ازہر میں اب بھی باقی ہے، اس جامعہ میں دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے طالب علم آتے ہیں اور مختلف قوموں کے لیے مختص "رواقوں" میں رہ کر علم حاصل کرتے ہیں،

[1] یہ درست ہے کہ یہاں سند عطا کرنے والے حضرات وہی نہیں ہوتے تھے۔

جامعہ کی مجلس انتظامی کی طرف سے خیراتی اور اوقافی مدات سے انھیں امداد دی جاتی ہے،[1] عربی کتابوں کے سرکاری طور پر ترجمہ کرنے والے سرکاری مترجموں کے کام شروع کرنے سے ایک صدی پہلے ہی لاطینی عالم جس طرح اندلس سے عربی علوم سیکھتے تھے، اس کی تفصیل بڑی مہارت اور وضاحت کے ساتھ "ورثۂ اسرائیل" میں پیش کی جاچکی ہے،[2] یورپ میں عربی

[1] ریش ڈال (Rashdall) نے لکھا ہے: "کسی موضوع یا کتاب کے 'پڑھنے' کے لیے ریکٹر (Rector) کی عطا کی ہوئی سند یا ایسے لکچروں کے نصاب کی تکمیل کسی کو 'فاضل' (Bechlor) بنا دیتی تھی، مذہبی قوانین کے طالب علم چار سال تک لکچر 'سننے' کے بعد کسی ایک عنوان پر لکچر دے سکتے تھے، 'سننے' اور 'پڑھنے' کے فنی معنی کے لحاظ سے عربی میں بھی ایسی ہی فنی اصطلاحیں موجود ہیں لیکن یہ مشابہتیں اور اسی طرح پانچ چھ سال تعلیم پانے کے بعد طالب علموں کو استاد مقرر کرنے کا عمل خاص اہمیت کے حامل نہیں یہی چیزیں اپنے آپ کسی بھی جامعہ میں ہوسکتی ہیں، اس پر اسرار لفظ (Baccalareus کی کوئی عربی اصل دریافت ہوجائے تو ہم کوئی قطعی رائے قائم کرسکیں گے (آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے اس لفظ کا جو مفہوم بتایا ہے، اسے مشکل ہی سے اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں جامعہ کے ایسے طالب علم کو 'Bachelor' کہتے تھے، جسے کسی استاد کے مکتب میں پڑھانے کی اجازت دی گئی ہو، اور اگرچہ کسی عرب مصنف کے یہاں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مجھے کوئی لفظ نہیں ملا، تاہم "بحق الروایۃ" (دوسروں کو سند پر تعلیم دینے کی اجازت) کا لفظ بہت قابل قبول مثال پیش کرتا ہی، بہرحال کہتے ہیں (بحوالۂ Hatzfeld Dormesteter) کہ یورپی ادب میں پہلی بار یہ لفظ قدیم فرانسیسی کتاب chanson de Roland میں استعمال ہوا ہے، اگر یہ قیاس درست ثابت ہوجائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ عربی اصل کا لفظ Bachelar کے لیے لیا گیا ہی، عربی نے ڈگری رکھنے والے کے لیے کوئی لفظ نہیں دیا، مالکہ عمدہ رکھنے والے کے لیے دیا ہے

[2] ملاحظہ ہو چارلس اور ڈورتھا سنگر کا مقالہ ص ۲۰۴، حاشیہ۔

تصورات کی اشاعت جہاں گشت عالم کر رہے تھے جن کی تحریریں آج باقی نہیں ہیں، اور اگرچہ جن ذرائع سے ابن سینا، الغزالی اور ابن رشد کی تصانیف لاطینی بولنے والی قوموں تک پہنچیں، ان کا پوری طرح سراغ نہیں لگ سکا ہے، لیکن اس سے پہلے کی صدیوں میں تصورات کے ٹھوس نفوذ کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے، اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا،

بارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں سگوویا کے آرچ ڈیکن ڈومی نک گندی سلوس نے جو ترجمے کیے ان کے ذریعہ نصرانی مغرب ابن سینا، فارابی اور غزالی کے واسطے سے ارسطو سے روشناس ہوا، خود گندی سلوس کے علم کے انسائیکلوپیڈیا کا انحصار بڑی حد تک ان معلومات پر ہے، جو اس نے عربی ماخذوں سے حاصل کی تھیں[۱]،

اکثر یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ مغرب کے لیے ارسطو کی بازیافت عربوں کے ذریعہ ہوئی، یہ بیان تشریح کا محتاج ہے، کہا جا سکتا ہے کہ گندی سلوس کے عہد تک یورپ میں شاید ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ ارسطو نامی کوئی فلسفی بھی ہوا ہے، لیکن ہمیں بتاتا ہے کہ بوتھوس پہلا ادمی ہے جس نے مغرب کو ارسطو سے روشناس کرایا، اس نے "مقولات عشرہ" (قاطیغوریاس (Categories) اور "شرح" (De Interpretation) کے جو ترجمے کیے تھے وہ اور منطق پر لکھے ہوئے خود اس کے رسالے ۱۱۵۰ء تک یورپ میں ارسطو کے علم کا واحد سب سے بڑا سرمایہ تھے، مغرب کو افلاطون سے براہ راست کسی ربط کے بغیر اسکے بارے میں حقیقتاً اتنا ہی معلوم تھا، جتنا کہ وہ ارسطو کے بارے میں جانتا تھا، لیکن افلاطونیت کو یہ شرف حاصل تھا کہ اس نے نصرانی تصورات میں مضبوطی کیساتھ اپنے قدم جمائے، ارسطو کی کتاب "ما بعد الطبیعیات" (Metaphysics) کا اولین لیکن نامکمل ترجمہ بازنطینی سلطنت سے ۱۲۰۰ء ہی میں پیرس پہنچا، اسکے چند

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ورثۂ اسرائیل" ص ۲۵۴ - ۲۵۶

سال بعد ایک اور نامکمل ترجمہ جو عربی سے کیا گیا تھا، پیرس آیا، ۱۲۶۰ء تک اس کا کوئی مکمل نسخہ عالموں کے ہاتھ نہ آسکا، نیقوماخوس کی "کتاب الاخلاق (Nicomachean Ethics) کا ترجمہ پہلے یونانی سے، پھر عربی سے اور آخر میں براہ راست یونانی سے ۱۲۵۰ء کے قریب کیا گیا، کتاب الطبیعیات (Physics) اور کتاب النفس (De Anima) کا پہلی بار یونانی ہی سے ترجمہ کیا گیا،

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارسطو کے فلسفہ کی بازیافت کے لیے مغرب عربوں کا اسی طرح رہین منت ہے جس طرح کہ یورپی عالموں کے دل میں ارسطو کی تصانیف سے رغبت پہلی بار عربی افکار سے واقفیت نے بہم پہنچائی تھی، بلا مبالغہ اہل یورپ نے ارسطو کا مطالعہ اس لیے شروع کیا کہ عربی افکار سے اتصال نے فلسفہ کے لیے ان کی آتش شوق کو بھڑکا دیا تھا، بے شبہ اگر پہلا پرتاثیر اثر عربی نہ تھا، تو پھر ہم اس حقیقت کی کیا توجیہ کر سکتے ہیں، کہ ابن رشد سے وابستہ تعلیمات کئی نسلوں تک ارسطو کی تعلیمات سے خلط ملط ہوتی رہیں، ابن رشد یونانی زبان سے ناواقف تھا، اور اس نے اپنی بنیں دوسروں کے کیے ہوئے ترجموں پر ہی تکیہ کیا تھا، اس کا نظام فلسفہ یہودیوں میں حد درجہ مقبول تھا، نصرانی فکر میں بھی وہ اس درجہ در آیا تھا کہ کلیسا کے عقائد کے لیے ایک خطرہ بن گیا اور سینٹ تھامس کو ارسطو کو اس کے شارح سے الگ کرنے اور اس کی عربی تشریح پر تنقید کا فخر حاصل ہوا،

یہاں ہمیں عربی فلسفہ اور دینیات کی ابتدا اور اس کے ارتقاء سے بحث نہیں، بلکہ مغربی فکر پر اس کے اثرات سے بحث ہے، لیکن اگر ہمیں عربوں کے اس مقام کو جو انہیں فلسفہ کی منتقلی کے سلسلہ میں حاصل ہے، سمجھنا ہے تو پھر ہمارے لیے ان کے

نظام فکر کا مختصر حال اور اس کی اصل کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے جائزے میں فلسفہ کو الٰہیات سے الگ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، فلسفہ اور الٰہیات کو ایک ہی مبحث قرار دینے کے لیے ہمارے پاس ایک بڑی سند موجود ہے، کیونکہ خود ارسطو ان مباحث کو جنھیں اب ہم "مابعد الطبعیات" کہتے ہیں "فلسفۂ اولیٰ" اور "دینیات" کہتا ہے، اور یونانیوں میں توحید نے دینی حلقوں میں نہیں بلکہ فلسفیوں کے حلقوں میں جنم لیا تھا، اسلام میں ان دونوں موضوعوں کی ابتدا اور ارتقا کی بحث میں یہ حقیقت کافی اہمیت کی حامل ہے، قبل نصرانیت عہد میں فلسفہ کا تعلق بنیادی طور پر ان چیزوں سے تھا، جن کا علم انسانی عقل کے ذریعہ ہوتا ہے، اور دینیات ابدی اشیا کے روحانی حقایق کی تفہیم کی دعوے دار تھی جن کا علم وحی کے ذریعہ ہوتا ہے، اسلامی دنیا نے مجموعی حیثیت سے اس طرح کی حد بندی ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، سینٹ تھامس اکیوناس اور ڈنس اسکوٹس (Duns scotus) دونوں فلسفہ اور دینیات کے درمیان امتیاز کو تسلیم کرتے ہیں، اور اپنے اپنے دائرے میں ہر ایک کی عظمت کے قائل ہیں، وہ اپنے عرب پیش روؤں کی طرح عقل اور وحی دونوں کو مستند مانتے ہیں، لیکن ہر جگہ اس پر اتفاق نہیں پایا جاتا کہ مابعد الطبعیات کے ذیل میں کونسی باتیں آتی ہیں، اور الہامی مذہب کے تحت کون مسائل، راجر بیکن نے تحصیل فلسفہ کی مدح میں جو مقالہ لکھا ہے اس میں اس مسئلہ کے بارے میں اپنے رجحان کا صاف صاف اظہار کیا ہے اور ان مشرقی ماخذوں کو گنایا ہے جنھوں نے اس کے رجحان کو تقویت دی ہے، اس نے لکھا ہے "فلسفیوں کے یہاں مابعد الطبعیات دینیات ہی کا ایک حصہ ہے، اور اس کے ساتھ فلسفۂ اخلاق کو ملا کر انھوں نے اسے علم المجردات[1] (scientia divina)

[1] مابعد الطبعیات پر ابن سینا کے رسالہ کا نام رسالہ علم الٰہیات،

اور دینیات طبعی (Theologia physica) کا نام دیا ہے، جیسا کہ ارسطو کی کتاب "مابعد الطبعیات" کے پہلے اور گیارھویں باب اور ابن سینا کی مابعد الطبعیات کے نویں اور دسویں باب سے ظاہر ہوتا ہے، "مابعد الطبعیات کا تعلق خدا سے متعلق بہت سی باتوں، فرشتوں اور اسی طرح کے مجردات سے ہوتا ہے"[2] پھر ایک جگہ لکھتا ہے "نظری فلسفہ کا مقصد مخلوق کے ذریعہ خالق کا علم ہے"[3] نصرانیوں کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ "فلسفہ اپنی ذات سے جہنم کی ظلمتوں کی طرف لے جانے والا ہے، اور اس لیے اس کو خود بھی ظلمت اور دھند ہونا چاہیے"[4]

عرب عالم بھی ان مسائل کے متعلق بڑی حد تک متفق الرائے نہیں ہیں، ابن سینا نے اس بات پر زور دیا کہ مابعد الطبعیات کا صحیح موضوع "الوجود من حیث ہو الوجود" (متعلق وجود) ہے، ابن رشد جسے ارسطو پر زیادہ اعتماد کا دعویٰ ہے، اس بات پر زور دیتا ہے کہ مابعد الطبعیات کا موضوع اللہ اور عقول عالیہ ہے، اس طرح لاطینی میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ان دو عرب فلسفیوں کے یہاں مابعد الطبعیات اور الٰہیات کے موضوع بحث کے بارے میں خیالات بالکل مختلف تھے، ابن رشد نے دعویٰ کیا ہے کہ وحی کے ذریعہ نازل کیے ہوئے دینی عقائد کے سوا تمام چیزوں کو عقل کی کسوٹی کے تابع ہونا چاہیے۔

اب پھر مسلمانوں میں فلسفیانہ علوم کی تحصیل کے شوق کی طرف آئیے، یہ فرض کرنے کی وجہ نظر نہیں آتی کہ ابتدائی خلفا کے زمانے کے عرب (جن سے ظفر مند فوجیں تیار ہوئی تھیں) نمایاں طور پر آج کے عربوں سے مختلف تھے، ہاں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں بے میل خون رکھنے والے بدویوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، یہ حقیقت موجودہ فلسفیوں کے دلوں

[2] Opus Majus, Philog، باب سوم [3] ایضاً باب ششم [4] ایضاً افسوس اب

میں مبالغہ آمیز توقعات کو ابھرنے نہ دیگی، ایسے لوگوں میں کسی قسم کے علم کا ایسا شوق نہ تھا جس کو کوئی
اہمیت دیجا سکے، وہ صرف تحصیل علم کی تحریک ہی کے محتاج نہ تھے، بلکہ تحصیل علم کے سامان کو بھی
باہر سے درآمد ہونا تھا، یہ تحریک اسوقت پیدا ہوئی جبکہ ایک دو نسلیں گذر گئیں، اور فاتح خلیفہ کو ایک جداگانہ
مذہبی جماعت کی حیثیت سے اپنی بقا کو حق بجانب ثابت کرنا پڑا، اس دوران میں نئے آنے والے ہتھیار کے بل بوتے
پر حکومت کر رہے تھے، انھوں نے صحرا کی تمام یا کسی نہ کسی طرح نمایاں خصوصیات کو
باقی رکھا تھا، ان لوگوں کی زبان ایک الگ ہی بولی تھی، ان لوگوں کو اپنے وجود
کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے اپنی ذہنی برتری جتانے کی ضرورت نہ تھی، مثال کے
طور پر شام میں ان کے نصرانی ہمسایوں نے آریائی رجحانات رکھنے والا ایک نیا فرقہ
سمجھا، اور ادھر خود عربوں نے تثلیث پرستی کو رواداری کی نظر سے دیکھا، لیکن کچھ زیادہ
سال نہیں گزرے کہ ریگستانی سامیوں اور زرخیز علاقوں کے رہنے والے سامیوں کا فرق
مٹتا گیا، خلفاء کی فوجوں میں ایسے ہزاروں عرب بھرتی ہونے لگے جو امدادی افواج کی
حیثیت سے "رومیوں" کی خدمت کر چکے تھے، شام، عراق اور مصر میں اکثر عربوں کو
خوش آمدید کہا گیا، کیونکہ انھوں نے تمامی لوٹ گھسوٹ کا خاتمہ کیا، اور انھوں نے بزنطیوں
کے مقابلے میں مقامی احساسات اور جذبات کو بہتر طریقہ پر سمجھا، پہلے پہل تو اسلام غیر واضح
تھا، ایک خدا کے اس سیدھے سادے عقیدے نے لازمی طور پر نصرانی عقائد کی تردید
کرنے والے پہلوؤں پر زور دینا شروع کیا اور مسلمانوں نے ایسے ضابطے ڈھونڈنے شروع
کیے جن کے ذریعہ وہ اپنا فیصلہ سنا سکیں

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہودیوں اور نصرانیوں کی ایک بڑی تعداد نے جزیہ سے
بچنے کے لیے اسلام قبول کر لیا، یہ جزیہ تمام وحدانیت پرست اور اہل کتاب اقوام سے

وصول کیا جاتا تھا[1]، یہ لوگ اپنے ساتھ بازنطینی اور ایرانی مملکتوں کی تہذیب لیتے آئے تھے،
اسلام کی اس وسیع پیمانہ پر اشاعت سے ارباب کلیسا گھبرا گئے اور بحثیں پیدا کر کے
اسلام کی بنیادوں پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے مثلاً اللہ کی ماہیت کیا ہے؟ اس قول کے
معنی کیا ہیں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور ہر چیز کا جاننے والا ہے؟ اگر اس نے اپنے اٹل
احکام کے ذریعہ پہلے ہی سے سب کچھ مقدر کر دیا ہے تو پھر انسان کا اختیار اور اسکی ذمہ داری
کہاں رہی؟ یہ ان مسائل میں سے چند مسائل ہیں، جن پر نصرانیوں کے مختلف فرقے صدیوں سے
بحث کرتے چلے آئے تھے، انھوں نے ان مسائل کو خود اعتمادی اور طنز کے ساتھ ملت اسلامیہ
کے سامنے پیش کیا، یہاں بھی ان مسائل نے ویسی ہی تلخی اور ویسی ہی نزاع پیدا کر دی جیسی
تلخی اور نزاع یہ اپنے اصلی گھر میں پیدا کر آئے تھے، کچھ زمانہ اور عہد ایسے بھی گزرے جب
اقتدار کی للکار نے اس طرح کے سوال کرنے والی آوازوں کو دبا دیا، لیکن زیادہ مخلص اور
سمجھدار جماعتوں نے ان سوالوں کی کسی نہ کسی طرح جواب دینے کی کوشش کی، پہلے پہل
جب جواب دیے گئے تو وہ غیر تشفی بخش اور وقتی تھے، ایک ایسی قوم کے لیے زبان اور
تصورات کی باریکیاں ایک اجنبی چیز تھی جس کا حاکم طبقہ فلسفہ کے وجود ہی سے ناآشنا
تھا، سنٹ جان دمشقی جب اپنے مسلمان حریفوں سے بحث کرتا تو ان کے جواب نہایت
شفقت اور علم کے ساتھ دیتا، لیکن مسلمان زیادہ دنوں تک اس بات پر مطمئن نہ رہ سکے
کہ ان کے مخالفوں کے ہاتھ میں یونانی علم کلام کے ہتھیار رہیں، انھوں نے بھی آہستہ آہستہ
یونانی اور شامی تحریروں میں پائے جانے والے فکری نظام سے اپنی واقفیت بڑھانی شروع
کی، اس ابتدائی عہد کی بہت کم باقیات ہم تک پہنچی ہیں، جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس میں

[1] میں نے یہودیوں کے اثرات کو "ورثہ اسرائیل" میں بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو کتاب مذکور کے صفحات ۱۲۹ اور مابعد

یہ روایت بھی ہے کہ مختلف فلسفیانہ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا، اور ابتدائی اہل فکر علمائے دین کے ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفیانہ شکوک و شبہات نے ان کے ذہن میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا،

یہ عباسی خلیفہ المامون (۱۹۸ھ/۸۱۳ء - ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) ہی تھا جس کی سرپرستی میں حقیقی طور پر فلسفہ نے جنم لیا، کیونکہ یہ خلیفہ اہل سنت کے عقیدہ کے برخلاف خلق قرآن کا قائل تھا، حالانکہ اہل سنت قرآن کے تمام عالموں سے بھی قدیم ہونے پر عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ کھلے بندوں معتزلہ[1] (یعنی دینی عقائد میں آزاد فکر علمائے دین) کے عقائد کا حامی تھا، ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فکر اور نصرانی دینیات سے واقف ہوئے مدت ہو چکی تھی، مامون نے بغداد میں بیت الحکمۃ قائم کیا تھا جس میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ یونانی کتابوں کا مطالعہ اور ترجمہ کیا جاتا تھا، اس کام میں نسطوری طبیب حنین بن اسحٰق العبادی (۸۰۹ء - ۸۷۳ء) اور اس کے خاندان نے بہت اہم حصہ لیا، حنین صرف بغداد ہی میں کام نہیں کرتا تھا، اس نے دنیائے قدیم کی طب اور کام چلاؤ یونانی زبان کی بہتر تحصیل کے لیے اسکندریہ جاتے ہوئے شام اور فلسطین کا سفر کیا، طب اور ریاضی پر بہت سے مقالات کو عربی کا جامہ پہنانے کے سوا اسے ارسطو کے "معقولات عشر" (Categories) "طبعیات" اور "اخلاق الکبیر" (Magna Moralia) اور افلاطون کی "جمہوریہ" (Republic) "النوامیس" (Laws) اور "محاورۃ طیماؤس" (Timaeus) کا ترجمہ کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے، اگرچہ ان کتابوں کا ہمیشہ پورا پورا ترجمہ نہیں ہوا، غالباً اس کا بیٹا اسحٰق (متوفی ۹۱۰ء) ہی "مابعد الطبیعات" (Metaphysics)

[1] اسی مضمون میں آگے معتزلہ کی تفصیل دیکھئے۔

"النفس" (de Anima) "الکون والفساد" (de generation Corruption) "العبارۃ" (Hermenenties) کے ساتھ ساتھ اسکندر افرودیسی (Alexander of Aphorodisias) کی تعلیقات (Commentaries) کے عربی میں ترجمہ کا ذمہ دار ہے، اس طرح جب حنین کے بھتیجے حبیش کے تراجم بھی شامل کر لیے گئے تو فلسفہ کے ہم عصر علم کا کوئی بڑا حصہ ایسا نہ رہا جسے عربی زبان میں نمائندگی نہ مل گئی ہو، کلاسیکی عہد کی شاعری، ڈرامے اور تاریخ سے عربوں نے دلچسپی محسوس نہیں کی،

غرض یہاں تک تو ہمیں بہت کم آزاد فکر ملتی ہے، اور "عربی فلسفہ" کی اصطلاح کا کوئی مصداق نہیں ملتا، ان لوگوں نے ترجموں کے جس دبستان کی بنیاد رکھی اس کو یعاقبہ (Jacobites) نے جاری رکھا، ان کی آزاد فکری کے دعوے کا بھی وہی حال ہے جو ان کے پیش رووں کا ہے، البتہ اس میں ایک استثناء ایک رسالہ ہے جو کسی قسطا بن لوقا نے نفس اور روح کے فرق پر لکھا تھا، اس کتاب نے لاطینی میں ترجمہ ہونے کے بعد لاطینی دنیا کو بہت متاثر کیا،

اسی عہد میں عربوں کے پیدا کیے ہوئے پہلے اور آخری فلسفی کا کام آتا ہے، ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی ایک ایسے عرب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جو جزیرۃ العرب کے جنوب سے آیا تھا، وہ ۸۰۰ء کے قریب کوفہ میں پیدا ہوا، اس نے بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی، اس نے اپنی زبان میں جو کچھ لکھا تھا اس کا بہت سا حصہ ہم تک نہیں پہنچا لیکن اس کا ایک بڑا حصہ لاطینی ترجموں کی صورت میں آج بھی موجود ہے، یہ ترجمے کریمونا کے جیراڈ (Gerard of Cremona) اور دوسرے لوگوں نے کیے ہیں، ریاضیات، ہیئت، کیمیا اور بصریات کے سلسلہ میں اس کے کارناموں سے ہمیں یہاں بحث نہیں،

اس نے سب سے بڑی بات یہ کی کہ ایک ایسی کتاب کے ترجمے کو اپنا نام اور اپنی سند بخشی جس نے آگے مشرق اور مغرب میں فلسفہ اور دینیات کی فکر پر اس وقت تک گہرا اثر ڈالا جب تک کہ سینٹ تھامس اکیونا س نے خود عربی ماخذوں سے بھی مدد لے کر اسے ہٹا نہ دیا، عربی میں اس کتاب کا عنوان حسب ذیل ہے: الفصل الاول من کتاب ارسطاطالیس الفیلسوف ویسمی بالیونانیۃ اثولوجیا (Theologia) الصوری (The Syrian) ونقلہ الی العربیۃ عبدالمسیح بن عبداللہ ناعمۃ الحمصی (of Emessa) واصلحہ لاحمد بن المعتصم باللہ. ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی رحمہ اللہ"[1] اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ کتاب ارسطو سے منسوب کی گئی ہے لیکن عنوان کہہ رہا ہے کہ یہ فرفوریوس سے منسوب تفسیر ہے، ممکن ہو "اثولوجیا" (Theologia) آگے چل کر ایسے زمانے میں ارسطو سے منسوب کر دی گئی ہو جب کہ نو افلاطونی دبستان کے صوفیانہ رجحانات نے اسلام میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی اور ارسطو کی سند بحیثیت فیلسوف اعظم حرف آخر مانی جاتی تھی، یہ کتاب کسی حیثیت سے بھی شرح نہیں، بلکہ نو افلاطونی دبستان کا ایک مقالہ ہے جو افلوطین (Plotinus) کی کتاب "اینڈس (Enneads) کے چوتھے اور پانچویں ابواب پر مشتمل ہے،

(باقی)

---

[1] Fr. Dieterici نے اس کتاب کو مرتب کر کے ۱۸۸۳ء میں لیپزگ سے شائع کر دیا ہے۔

علامہ ابن عساکر

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

اسلام کی بدولت مسلمانوں میں بڑے بڑے اہل علم، صاحب کمال اور نامور علماء و فضلاء گذرے ہیں، جن کے علمی و عملی کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے، مگر بدقسمتی سے ان میں سے بعض کے حالات بہت کم معلوم ہیں، ان ہی میں ایک اہم اور بلند پایہ شخصیت علامہ ابن عساکر کی ہے، جو اگرچہ تاریخ اسلام کے بڑے فاضل تھے مگر ..... تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ نہ ملنے کے برابر ہیں، اس مضمون میں ان کے جو تھوڑے بہت حالات معلوم ہو سکے ہیں انھیں پیش کیا جاتا ہے،

نام و نسب آپ کا لقب ثقۃ الدین، کنیت ابو القاسم اور نام علی تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن حسن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسین،[1]

علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ ابن عساکر کے آباء و اجداد میں عساکر نام کا کوئی شخص نہیں گذرا ہے، پھر بھی انھیں ابن عساکر ہی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہیں،

ابن عساکر کی مشہور تصنیف "تبیین کذب المفتری ....." کے شروع میں ان کے جو مختصر حالات قلمبند کیے گئے ہیں، ان میں ذیل الروضتین کے حوالہ سے یہ تصریح ملتی ہے کہ انکے

---

[1] ابن خلکان ج ۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۴، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴

اجداد میں کسی کا نام عساکر نہیں تھا، اس نام کی شہرت انکے خاندان میں غالباً کسی ننہالی رشتہ کی نسبت سے ہوئی ہے۔

پیدائش اور وطن قدیم زمانہ سے دمشق شام کا نہایت معمور و مشہور شہر اور اس کا پایۂ تخت ہے، اس کی خاک بڑی مردم خیز ہے، یہاں ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء پیدا ہوئے، حافظ ابن عساکر بھی اسی مردم خیز شہر کے مایۂ ناز فرزند ہیں، عام مورخین کا بیان ہے کہ وہ محرم ۴۹۹ھ میں پیدا ہوئے، اگرچہ تاریخ کی تعیین میں اختلاف ہے، اور ابن سبکی نے ماہ رجب ۴۹۹ھ بتایا ہے، لیکن صاحب شذرات الذہب کے نزدیک سال پیدائش ۵۸۱ھ ہے، ہمارے خیال میں عام مورخین کا بیان ہی صحیح ہے، جیسا کہ وفات کے تذکرہ میں ہم مزید توضیح کریں گے،

تعلیم اور حصول علم کے لیے سفر گذشتہ زمانہ میں جبکہ آج کی طرح سفر و سیاحت کی سہولتیں میسر نہ تھیں، ہمارے علماء و مشائخ کا دور دراز کے ملکوں میں حصول علم کے لیے پیدل چلکر جانا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، جس سے علم کے ساتھ ان کے شغف اور شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے، چنانچہ علامہ ابن عساکر نے بھی شوق علم میں مشقتیں اٹھا کر دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کیا، اور اپنے زمانہ کے اہل فن و کمال ... سے فیضیاب ہوئے، علامہ ابن سبکی کہتے ہیں

فاسہرہ اللیالی فی طلب العلم وغیرہ سہرھا فی الشہوات اونامہا

۱۰ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی کی توجہ سے اپنے وطن دمشق میں حدیث کا سماع کیا، اور پھر برابر یہ سلسلہ جاری رہا، یہانتک کہ ۵۲۰ھ میں دمشق سے بغداد گئے،[1] اور پانچ سال تک وہاں اہل علم اور ارباب فضل سے استفادہ اور مدرسہ نظامیہ کے

[1] علامہ ابن عساکر حصول علم کے لیے بغداد کئی مرتبہ تشریف لے گئے تھے،

درسوں میں شرکت کرتے رہے، پھر دمشق واپس آئے، اس کے بعد مکہ، مدینہ، کوفہ، اصبہان، نیشاپور، ہراۃ، سرخس، طوس، بسطام، رے، زنجان اور خراسان وغیرہ مختلف مقامات پر جاکر وہاں کے اساتذہ اور شیوخ سے کسب فیض کیا،[1] علامہ ابن کثیر آپ کی تحصیل علم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وقد اکثر فی طلب الحدیث من الترحال والاسفار وجاز البلدان والاقالیم والامصار

بعض علوم میں آپ کا امتیاز یوں تو ابن عساکر کو تمام علوم و فنون سے دلچسپی تھی، لیکن تاریخ رجال، فقہ، حدیث اور نحو میں خاص امتیاز حاصل تھا، فن تاریخ میں آپ کی امامت مسلم ہے، اور نحو میں بھی آپ کی مہارت مشہور ہے، ابن اثیر لکھتے ہیں:

وکان نحویا جیدا[2]

اور وہ بڑے جید عالم نحو تھے۔

فقہ اور مسائل اختلافیہ کا خاص ذوق رکھتے تھے، اس بنا پر آپ کا شمار جلیل القدر فقہائے شافعیہ میں ہوتا تھا،

حدیث کا ذوق و شوق تمام فنون پر حاوی تھا، اپنے اشعار میں علم حدیث کی فضیلت بیان کرتے ہیں ؎

الا ان الحدیث اجل علم　　　واشرفہ الاحادیث العوالی

اس فن میں انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، اور اپنے زمانہ میں محدث الشام اور امام المحدثین کے ممتاز لقب سے یاد کئے جاتے تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

غلب علیہ الحدیث فاشتہر بہ وبالغ فی طلبہ الی ان جمع مالم یتفق لغیرہ

اساتذہ اور شیوخ ابن عساکر کے اساتذہ اور شیوخ کا حلقہ بڑا وسیع اور ان کے ناموں کا

[1] طبقات ابن السبکی ج ۴ [2] تاریخ ابن اثیر ج ۱۱

استقصا دشوار ہے، اصحاب سیر و تذکرہ کا اجمالی اور متفقہ بیان ہے کہ ایک ہزار تین سو اشخاص اور اسّی سے زائد عورتوں سے سماع حدیث اور اکتساب علم کیا ہے، بعض مشہور شیوخ اور اساتذہ کے نام یہ ہیں: دمشق میں اپنے والد حسن اور اپنے بھائی صائن الدین کے علاوہ ابوالقاسم نسیب، قوام بن زیاد، سبیع بن قیراط، ابوطاہر حنائی، ابوالحسن موازینی، ابو محمد اکفانی، ابوالحسن بن قبیس اور عبدالکریم بن حمزہ وغیرہ سے۔ بغداد میں ابوالقاسم بن حصین، ابوالحسین دینوری، ابوالعز بن کادس، ابوالغالب بن عباد، ابو عبداللہ بارع، محمد بن عبد الباقی قاضی مارستان اور قراتکین بن اسعد وغیرہ سے، مکہ میں عبداللہ بن محمد اور رزین بن معاویہ عبدری وغیرہ سے، مدینہ میں عبدالخلاق بن عبدالواسع ہروی وغیرہ سے، کوفہ میں عمر بن ابراہیم زینبی وغیرہ سے، اصبہان میں ابو عبداللہ فراوی، عبدالمنعم بن قشیری، سعید بن ابورجا اور حسین بن عبدالملک وغیرہ سے مرو میں یوسف بن ایوب ہمدانی وغیرہ سے اور ہراۃ میں تمیم بن ابی سعید جرجانی وغیرہ اکابر اور مشاہیر محدثین سے حدیث نبوی کا سماع کیا،

تلامذہ شیوخ کی طرح شاگردوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، مدت مدید تک دارالحدیث نوریہ میں درس دیتے اور ہزاروں طالبان علوم نبوت کو بہرہ ور کرتے رہے، بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: آپ کے بیٹوں اور خاندان والوں کے علاوہ معمر بن فاخر، ابوالعلا ہمدانی، ابوسعد سمعانیؒ[1] اور کبار نے آپ سے سماع کیا ہے اور عبدالقادر رہاوی ابوالقاسم ابن حصری، یونس بن محمد فارقی، ابونصر شیرازی، محمد بن اخی ابوالبنان ابراہیم بن خشونی عبدالمعز، یونس بن ثور سغیانی، محمد بن رومی، محمد بن عسان حمصی، مسلم بن احمد مازنی، ذاکر اللہ شعیری، عبدالرحمٰن بن راشد، عمر بن عبدالوہاب عتیق سلمانی، شیخ بہاء الدین ارشد

[1] ابوسعد سمعانی سے نسبت تلمذ بھی حاصل ہے، اس طرح دونوں ایک دوسرے کے استاد و شاگرد ہیں،

ابن مسلم اور مکی بن علان وغیرہ اجلۂ علماء نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں،

تصنیفات ابن عساکر کثیر التصانیف ہیں، علامہ ذہبی اور یاقوت نے ان کی تصنیفات کی طویل فہرست دی ہے، جس پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں علوم شرعیہ میں بڑا رسوخ اور کامل عبور حاصل تھا، ان کی تصانیف میں اسلوب بیان، انداز تحریر اور ادب و انشاء کی تمام خصوصیات اور خوبیاں موجود ہیں، ان میں سے ہم صرف دو اہم تصنیفات کا اجمالی تعارف کراتے ہیں، کیونکہ یہی دونوں کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں،

تاریخ دمشق یہ کتاب ۸۰ جلدوں میں تھی، اس کی صرف چند جلدیں چھپی ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے مصنف کی وسعت نظر، تبحر علمی، سلاست بیان اور مذاق تالیف کی بلندی اور پختگی کا یقین ہو جاتا ہے،

مصنف نے اس کتاب کی پہلی جلد میں ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جو ۲۶۶ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، اس مقدمہ میں شام، دمشق اور لفظ تاریخ کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی لغوی اور علمی تحقیق کی گئی ہے، شام و دمشق سے متعلق بہت سے احوال و کوائف، اسلام سے پہلے اور بعد کے نامور اشخاص اور مشہور واقعات کا تذکرہ اور دمشق و شام کے فضائل سے متعلق احادیث و آثار کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے

پھر پہلی ہی جلد میں جہاں سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے، سب سے پہلے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، جو ۲۶۷ صفحے سے ۳۹۰ صفحے تک پھیلا ہوا ہے، اس حصہ میں بعض نہایت اہم علمی، تحقیقی اور تاریخی واقعات و مباحث زیر بحث آگئے ہیں،

اسکے بعد ان اکابر صحابہ، تابعین، مشائخ، اولیا، اہل علم اور اصحاب کمال کا تذکرہ

ہے جو دمشق میں گذرے ہیں یا کبھی وہاں تشریف لے گئے تھے، اس طرح گویا یہ کتاب ابن خطیب کی تاریخ بغداد کے نہج پر مرتب کی گئی ہے، مگر افادیت اور ضخامت کے لحاظ سے اس سے زیادہ ہے، لیکن اس میں صحیح روایتوں اور صحیح اقوال کے نقل کرنے کا التزام نہیں کیا گیا ہے، اس لیے صحیح و غلط میں تمیز اور رطب و یابس میں تفریق کرنا پڑھنے والے کا کام ہے، یہ تصنیف بہت سی تصنیفات پر بھاری ہے، اور اگر مصنف کی اس کے علاوہ کوئی اور تصنیف نہ ہوتی جب بھی ان کی شہرت کے لیے کافی ہے، اور محض اس کتاب کی بدولت ان کے علمی کارنامے ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے، حیرت ہوتی ہے کہ اتنی ضخیم اور بلند پایہ کتاب کس طرح ۳۰ سال کی عمر میں لکھی جب کہ اس کے ساتھ ان کی اور بہت سی تصانیف ہیں،

ابن خلکان کا بیان ہے:

"ایک مرتبہ اس تاریخ کا ذکر اور اس کی اہمیت اور عظمت پر ایک طویل گفتگو ہو رہی تھی تو ہمارے استاذ عبدالعظیم منذری نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ ابن عساکر نے ہوش سنبھالتے ہی اس کتاب کی تالیف و ترتیب کا کام شروع کر دیا ہوگا، ورنہ اتنی مشغولیتوں کے باوجود کیسے اتنی عظیم کتاب مرتب کر سکتے، یقیناً عمر اس کے لیے ناکافی ہوگی۔"[1]

تاریخ دمشق کے متعلق اہل قلم کی رائیں

اس تاریخ کے متعلق علماء کے بہت سے اقوال ملتے ہیں ان میں سے چند مشہور لوگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

ولہ تاریخ الشام فی ثمانین مجلدۃ	ان کی کتاب تاریخ شام جو ۸۰ جلدوں
او اکثر ابان فیہ عما لم یکتمہ	میں ہے یا اس سے زائد، اس میں ایسی

۱؎ تاریخ ابن خلکان ج ۲

غیرہ و انما عجز عنہ من طالع	باتیں بیان کی ہیں جن کے بیان سے دوسرے
ھذا الکتاب عرف الی ای مرتبۃ	لوگ قاصر ہیں، جو اس کتاب کا مطالعہ
وصل ھذا الامام واستقل	کرے گا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گی
الثریا وما رضی بدرا التمام	کہ کس مرتبہ بلند پر یہ امام ابن عساکر فائز
	ہیں وہ بدر کامل کو ناپسند کر کے اوج ثریا پر
	جا گزیں ہوئے ہیں،[1]

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:-

صنف تاریخ الشام فی ثمانین	انھوں نے ۸۰ جلدوں میں تاریخ شام
مجلدۃ فھی باقیۃ بعدہ مخلدۃ	لکھی ہے جو ہمیشہ باقی رہیگی ان سے پہلے
وقد ساد فیہا علی من تقدمہ من	کے مورخین کے لیے بھی ایسی تاریخ لکھنا
المورخین واتعب من یاتی بعدہ	نادر تھا، اور بعد والوں کو تو انھوں نے
من المتاخرین فحاز فیہ قصب	بالکل درماندہ کر دیا، اس طرح وہ اس
السبق من نظر فیہ وتاملہ رای	کتاب کے ذریعہ سب پر حاوی ہو گئے تھے،
ما وصفہ فیہ واصلہ وحکم بانہ	جو لوگ اس کو بغور پڑھیں گے انہیں
فرید دھرہ فی التواریخ وانہ	اس کی خوبیوں کا اندازہ ہوگا اور وہ
الذروۃ العلیا من الشماریخ[2]	فیصلہ کریں گے کہ حافظ ابن عساکر اپنے
	زمانہ میں تواریخ میں یکتا اور سب سے
	بلند مقام پر فائز تھے،

۱؎ طبقات ابن سبکی ج ۴ ۲؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۲

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

اعظمها تاریخ الامام الحافظ ابن عساکر ..... وهو فی نحو ثمانین مجلداً ذکر تراجم الاعیان والرواة ومرویاتهم علی نسق تاریخ بغداد للخطیب ولکنه اعظم منه حجماً[1]

سب سے عظیم حافظ ابن عساکر کی تاریخ ہے، ......جو تقریباً ۸۰ جلدوں میں ہے، کتاب میں مشاہیر اور حفاظ کی سوانح عمریاں اور ان کی روایتیں خطیب کی تاریخ بغداد کے انداز پر لکھی ہیں، لیکن یہ کتاب اس سے زیادہ ضخیم ہے۔

علامہ ابن خلکان کی رائے ہے:

صنف التاریخ الکبیر لدمشق فی ثمانین مجلداً اتی فیه بالعجائب وهو علی نسق تاریخ بغداد[2]

اسی جلدوں میں دمشق کی بہت بڑی تاریخ لکھی جس میں عجیب عجیب باتیں بیان کی ہیں اور یہ تاریخ بغداد کے طرز کی کتاب ہے،

غرض یہ تاریخی، علمی، ادبی اور دینی ہر حیثیت سے ایک مفید، بلند پایہ اور پر از معلومات کتاب اور مصنف کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ اپنی خوبیوں کے اعتبار سے دیگر تاریخی کتابوں پر تفوق اور امتیاز رکھتی ہے۔

تکملے اور تلخیصات

اس کتاب کے متعدد ضمیمے بھی لکھے گئے، ان میں ایک ضمیمہ آپ کے بیٹے قاسم کا بھی ہے، مگر وہ ناتمام ہے، ان کے علاوہ صدر الدین بکری اور عمر بن حاجب نے تکملے لکھے ہیں،

اس کتاب کو بہت سے لوگوں نے ملخص اور مختصر بھی کیا ہے، بعض تلخیصات یہ ہیں:

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۵ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲

۱۔ ابو شامہ عبد الرحمن بن اسماعیل دمشقی (متوفی ۶۶۵ھ) نے ۱۵ جلدوں میں اس کی تلخیص کی ہے،

۲۔ قاضی جمال الدین محمد بن مکرم صاحب لسان العرب (متوفی ۷۱۱ھ) نے بھی تقریباً ۲۰ جلدوں میں اس کی تلخیص کی ہے،

۳۔ بدر الدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ) نے بھی اس کو مختصر کیا ہے،

ان کے علاوہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے تحفۃ المذاکر المنتقی من تاریخ ابن عساکر لکھی ہے،[1]

تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری

اس کا شمار بھی علامہ ابن عساکر کی مفید اور بہترین تصنیفات میں ہوتا ہے، اور مصنف کی حسن تصنیف، علو نظر اور عالمانہ شان کی آئینہ دار ہے،

یہ کتاب تقریباً سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے، اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، امام ابو الحسن اشعری کے دفاع اور حمایت میں لکھی گئی ہے، لیکن حقیقۃً اشاعرہ اور اہل سنت کے دفاع اور حمایت میں ہے، اس کتاب میں امام اشعری اور مشاہیر اشاعرہ کے تذکروں اور ان کے حالات کے ساتھ بعض علمی اور کلامی مباحث کو بھی بڑے حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب نہ صرف تذکرہ و تراجم بلکہ عقائد و کلام کی بھی ایک عمدہ کتاب ہے۔ مصنف نے اس کو لکھ کر اشاعرہ پر زبردست احسان کیا ہے،

اس کتاب کی اہمیت و عظمت کو بیان کرتے ہوئے علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں،

[1] کشف الظنون ج ۱

وھو من اجل الکتب فائدۃ — بہت مفید کتاب ہے، کہا جاتا ہے کہ جس
فیقال کل سنی لا یکون عندہ — بلند مرتبت کے پاس یہ کتاب نہ ہو اسے
ذالک الکتاب فلیس من نفسہ — کوئی بصیرت حاصل نہیں اور فی الحقیقت
علی بصیرۃ ولا یکون الفقیہ — فقیہ اس کتاب کی تحصیل کے بغیر شافعی نہیں
شافعیا علی الحقیقۃ حتی یحصل لہ — ہو سکتا، اور ہمارے اساتذہ و شیوخ طالبعلموں
ذالک وکان مشائخنا یامرون — کو اس کتاب کے نظر و مطالعہ کی
الطلبۃ بالنظر فیہ [1] — تلقین فرمایا کرتے تھے،

غرض یہ کتاب نہایت فاضلانہ، مفید اور مصنف کی عظمت شان کا بیّن ثبوت ہے، اس کتاب کے بھی چند تکملے لکھے گئے ہیں، جن میں ابن معلم کا تکملہ مشہور ہے، اور عبد اللہ ابن اسعد یافعی نے اس کی تلخیص بھی کی ہے [2]

شعر و سخن علامہ ابن عساکر تصنیف و تالیف کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، ان کی تصنیفات میں جابجا دوسروں کے اشعار ملتے ہیں، اور کہیں کہیں خود ان کے بھی اشعار ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

ایا نفس ویحک جاء المشیب — فماذا التصابی وماذا الغزل
وائے افسوس بڑھاپا آگیا — اب عالم طفولیت کی دلچسپیوں اور عشق و محبت سے کیا سروکار

تولی شبابی کان لم یکن — وجاء مشیبی کان لم یزل
دور شباب اس طرح ختم ہو گیا کہ گویا تھا ہی نہیں — اور بڑھاپا اس طرح آدھمکا کہ گویا ہمیشہ سے ہے

کانی بنفسی علی غرۃ — وخطب المنون بھا قد نزل
میں اپنے نفس کے متعلق فریب اور سرشاری میں مبتلا تھا حالانکہ حوادث روزگار کا شکار ہو چکا تھا

فیا لیت شعری ممن اکون — وما قدر اللہ لی بالازل [1]
کاش میں جانتا کہ میں کن لوگوں کیساتھ ہونگا — اور اللہ نے ازل سے میرے لیے کیا مقدر کر رکھا ہے

لیکن ان کی طرف منسوب تمام اشعار کو پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان ہی کے اشعار ہیں، لیکن آپ کی شعر گوئی مسلّم ہے کیونکہ عام طور سے تمام اہل سیر و تذکرہ اس پر متفق ہیں اور خود ان کی کتابوں میں بھی کہیں کہیں ان کے اشعار ملتے ہیں، سبکی کہتے ہیں: وللحافظ شعر کثیر قلما اخلی مجلسا الا وختمہ بشیء من شعرہ.

علمی پایہ حافظ ابن عساکر کا علمی پایہ بہت بلند ہے، وہ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں خصوصیت سے تاریخ شام ان کی علمی عظمت و برتری کا بیّن ترین ثبوت ہے،

وہ تحریر کے ساتھ تقریر و بیان کی بھی پوری صلاحیت رکھتے تھے، اور قلم کی قوت کے ساتھ درس و افتاء کی مسند کی بھی زینت تھے، انھوں نے جس طرح اپنی تصنیفات کے ذریعہ علم و مذہب کی خدمت اور علمی عقدوں کی گرہ کشائی کی ہے، اسی طرح درس و تدریس کے ذریعہ ہزاروں تشنگان علم کو سیراب بھی کیا ہے، ان کی ذات سے مدتوں دار الحدیث نوریہ میں علوم نبوت کی مشعل روشن رہی،

وہ غیر معمولی ذکی اور ذہین تھے، اور اپنی ذکاوت و فطانت کے باعث "شعلۂ نار" کہے جاتے تھے، قوت حافظہ بھی بہت قوی تھی، ضبط و ثقاہت میں بے نظیر تھے، علم و فن میں ان کے زمانہ میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، تمام علوم متداولہ میں کامل بصیرت حاصل تھی، اپنے زمانہ میں امام المحدثین اور محدث شام کہے جاتے تھے، اور جلیل القدر فقہائے شافعیہ میں شمار کیے جاتے تھے، [2]

[1] تاریخ ابن خلکان [2] طبقات ابن سبکی ج ۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴، معجم الادبا اور تبیین کذب المفتری،

ابن نجار کا بیان ہے:

هو امام المحدثين في وقته ومن انتهت اليه الرياسة في الحفظ والاتقان والمعرفة التامة لعلوم الحديث والثقة والنبل وحسن التصنيف والتجويد وبه ختم هذا الشان[۱]

وہ اپنے دور کے محدثین کے امام تھے، اور حفظ و ضبط علوم حدیث کی تکمیل ہی، ثقاہت، شرافت اور حسن تصنیف و تجوید میں ان کو پورا رسوخ اور کمال ولایت حاصل تھی اور ان کی ذات پر یہ سب ختم ہوگئی۔

مشہور محدث اور احادیث نبوی کے شارح علامہ نووی ابن عساکر کے ضبط و حفظ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

هو حافظ الشام بل هو حافظ الدنيا مطلقا الثقة والثبت[۲]

وہ ملک شام ہی کے نہیں سارے عالم کے علی الاطلاق حافظ تھے اور نہایت ثقہ و ثابت شخص تھے۔

معمر بن فاخر کا بیان ہے کہ "میں نے طلباء حدیث میں ابن عساکر سے بڑھکر کسی کو حافظ نہیں پایا"[۳]

ابو العلاء ہمدانی کے ایک شاگرد نے ان سے طلب حدیث کے لیے سفر کی اجازت چاہی تو انھوں نے جواب میں کہا، اگر مجھ سے بڑھکر کسی عالم یا کم از کم علم و فضل میں میرے ہم پایہ کسی استاذ کے یہاں جانا چاہو تو میں اجازت دے سکتا ہوں ورنہ نہیں، البتہ اگر ابن عساکر کی خدمت میں حاضر ہونا چاہو تو اس کی پوری اجازت ہے، وہ واقعی معنوں میں

۱ تا ۳ طبقات ابن سبکی ج ۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ معجم الادبا اور تبیین کذب المفتری

حافظ حدیث ہیں[۱]

ابو العلاء کہتے ہیں کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ ابن عساکر کا کوئی علم و فضل میں شریک و سہیم نہیں، اور اگر وہ ہماری طرح لوگوں سے گھل مل کر رہیں تو موافقین اور مخالفین کی ان کے گرد بھیڑ لگ جائے[۲]

جب آپ بغداد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگ آپ سے مل کر بہت مسرور ہوئے اور کہنے لگے کہ دمشق کے تین اشخاص (شیخ یوسف، صائن ابو الحسین اور ان کے برادر خورد ابن عساکر) جیسا ہم نے کسی کو نہیں دیکھا[۳]

خود ان کے استاد شیخ مختار بن عبد الحمید فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس جب ابو علی آئے تو ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ ان سے اچھا کوئی نہیں، اور جب سمعانی آئے تو یہی رائے ان کے متعلق ہوگئی، لیکن جب ابن عساکر آئے تو یہ سب سے بڑھ کر ثابت ہوئے، اور انکے سامنے سب ہیچ ہو گئے[۴]

غرض وہ اپنے زمانہ کے جلیل القدر فاضل، بلند پایہ محدث، زبردست حافظ حدیث، نامور فقیہ و مفتی، جملہ علوم و فنون کے جامع و ماہر، اشاعرہ اور اہل سنت والجماعت کے پرزور مدافع، حامی سنت، قامع بدعت اور مسلک شافعی کے لیے باعث فخر و ناز تھے، ابن قاضی شہبہ کا بیان ہے: هو فخر الشافعية وامام الحديث في زمانهم وحامل لوائهم[۵]

علمی و دینی پایہ

علامہ ابن عساکر علم کے ساتھ عمل کے بھی پیکر اور نہایت دیندار اور باعمل عالم اور انما يخشى الله من عباده العلماء کی کامل اور واضح تصویر تھے،

عبادت اور زہد و تقویٰ

طہارت و تقویٰ اور خدا ترسی میں ان کا درجہ بہت بلند تھا،

۱ تا ۴ طبقات ابن سبکی جلد ۴ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۴، معجم الادبا اور تبیین کذب المفتری

۵ تبیین کذب المفتری

نہایت متشرع اور بڑے عبادت گذار تھے،

نماز پنجگانہ کو خاص اہتمام و التزام اور اس کے تمام آداب و ضوابط کے ساتھ ادا کرتے تھے، جماعت کا اتنا خیال تھا کہ ان کے بیٹے قاسم کا بیان ہے کہ میرے والد چالیس برس تک مسلسل (بشرطیکہ کوئی عذر نہ رہا ہو) پہلی صف میں شامل اور شریک ہو کر نماز ادا کرتے تھے،

صوم و صلوٰۃ اور دوسرے تمام ارکان دین کے سخت پابند تھے، پابندی سے اعتکاف کرتے تھے، اور ہمیشہ مسجد جامع میں معتکف ہوتے تھے، تلاوت قرآن کا یہ حال تھا کہ ہر ہفتہ میں پورا قرآن ختم کرتے تھے، رمضان کے زمانہ میں روزانہ ایک قرآن پورا کرتے تھے،

نوافل کثرت سے پڑھتے، اذکار و اوراد کے بھی پابند تھے، مقدس راتوں خصوصاً عیدین کی راتوں میں شب بیداری کرتے اور ساری رات خدا کے ذکر و فکر اور عبادت و طاعت میں گذار دیتے، ہمیشہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے اور جو لمحہ طاعت الٰہی میں نہ گذرتا، اس پر اظہار افسوس کرتے، غرض وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، اسماعیل بن محمد کہتے ہیں کہ ابن عساکر سے زیادہ صاحب ورع میں نے نہیں دیکھا، حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی بڑا اہتمام تھا، تمام لوگوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کرتے، صلۂ رحمی کا خاص خیال رکھتے اور رشتہ داروں اور قرابتمندوں کے حقوق ادا کرتے،

امر بالمعروف ونہی عن المنکر احیاء سنت اور ردِ بدعت ان کی زندگی کا مقصد تھا، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے علم دین کی اشاعت اور خدمت کے بڑے کام لیے، چنانچہ آپ کو ناصر السنت

اور قامع البدعت کہا جاتا ہے،

وہ عمر بھر حق کی مدافعت، مبتدعین کا مقابلہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مقدس فریضہ کو لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر انجام دیتے رہے،

دنیا سے بے رغبتی دولت دنیا اور اس کی لذتوں سے بے پرواہ ہو کر ہمیشہ آخرت کی کامیابی اور سرفرازی پر نظر رکھی، دنیوی جاہ و حشمت اور نام و نمود سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور عقبیٰ کی فکر دامنگیر رہی، ان کے سامنے بارہا دینی مناصب پیش کیے گئے، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، امرا و اصحاب زر کو کبھی خاطر میں نہ لائے،

محمود بن زنگی نے آپ کے لیے جب دار الحدیث تعمیر کیا تو آپ دمشق کی پر عیش و راحت زندگی کو خیرباد کہہ کر کتاب و سنت کی خدمت اور علم دین کی نشر و اشاعت اور خدا کی عبادت و ریاضت میں لگ گئے اور اسی عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔[1]

جب مسند درس پر متمکن ہوئے تو فرمایا کہ بخدا میں کسی عزت و ریاست اور لالچ کی خاطر یہ سب کچھ نہیں کر رہا ہوں،

خاندان علامہ ابن عساکر کا خاندان علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا گہوارہ تھا، بڑے بڑے نامور علما، اور اہل تقویٰ اس خاندان میں گذرے ہیں، اور ایک عرصہ تک اس خاندان میں علم و فن کا چرچا رہا،

مال و دولت اور شہرت و عزت میں بھی ان کا گھرانا مشہور تھا، وہ خود ایک صاحب حیثیت، معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کا شمار دمشق کے

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ

رؤسا و شرفا، اور اہل ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔[۱]

وفات: جمہور مورخین اور سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ ان کی وفات ۱۱ رجب ۵۷۱ھ میں ہوئی، لیکن صاحب شذرات کا بیان ان سب سے مختلف ہے، انھوں نے ۵۶۹ھ لکھا ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ان کا سنہ وفات ۵۷۱ھ لکھا ہے، اور علامہ ابن کثیر بھی فرماتے ہیں:

کانت وفاته فی الحادی عشر من رجب له من العمر ثنتان وسبعون[۲]

ان کا انتقال ۱۱ رجب (۵۷۱ھ) کو ۷۲ سال کی عمر میں ہوا،

ابن اثیر اور ابن کثیر کے ان بیانات کی موجودگی میں ابن عماد کی روایت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی،

نماز جنازہ شیخ قطب الدین نیشاپوری نے پڑھائی، سلطان صلاح الدین بھی شریک جنازہ رہے، اپنے والد بزرگوار اور اہل خاندان کے پہلو میں باب الصغیر کے مقبرہ[۴] میں سپرد خاک کیے گئے،[۳]

۱؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ و تبیین کذب المفتری ۲؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ۳؎ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ۴؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۲

رحمت عالمؐ

حافظ کا مذہب

از مولوی مرزا محمد یوسف صاحب فیلو مدرسہ عالیہ رامپور

(۲)

(۲) دوسرا قرینہ ڈاکٹر صاحب نے حافظ کے تسنن پر یہ قائم کیا ہے کہ:

"حافظ نے جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر بطور یقین اہل تسنن تھے اور کسی ایک کا بطور گمان کے بھی شیعہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا"۔

لیکن یہ کوئی دلیل نہیں ہے، ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ایک شیعہ کسی غیر شیعہ کے ساتھ حسن عقیدت نہیں رکھ سکتا جس کو کوئی شخص تسلیم نہیں کر سکتا، اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے، نہ صرف یہ کہ شیعی شعرا نے سنی ممدوحوں کی مدح کی ہے بلکہ مسلمان شعرا نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی اپنے خلوص کا اظہار کیا ہے، شریف رضی نے ابو اسحٰق صابی کا جو مرثیہ لکھا تھا وہ اس کا شاہد عدل ہے، رضی کا یہ مطلع ؎

ارأیت من حملوا علی الأعواد ارأیت کیف خبا ضیاء النادی

ہی اس کے خلوص و محبت کا مظہر ہے، جب لوگوں نے رضی کو ملامت کی کہ آپ نے شریف ہونے کے باوجود ایک صابی کا مرثیہ لکھا تو فرمایا "انما رثیت فضلہ" (میں نے صرف اسکے علم و فضل کا مرثیہ لکھا ہے)، دور کیوں جایئے خود ہندوستان میں بہت سے شیعی شعرا نے جہانگیر، شاہجہاں اور دوسرے سنی امراء و اکابر کی مدح میں قصائد کہے، کیا اس سے ہم مداحوں

کو سنی سمجھ لیں یا ممدوحین کو شیعہ یا مدح گستری کو منافقت، یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعرا کی مدح کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ ان کا پیشہ ہی مداحی ہے، مگر ان سے قطع نظر طبقات و تراجم کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جن کے شیعہ مصنفین نے سنی اہل کمال کا اور سنی مصنفین نے شیعہ اہل کمال کا ذکر نہ کیا ہو،

اس اجمالی تبصرے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے استدلال کا جائزہ لیا جاتا ہے، انھوں نے پہلے شیخ ابو اسحٰق کے دربار کے پانچ نورتنوں کی تعریف میں حافظ کا ایک قطعہ نقل کیا ہے، مگر حقیقتاً یہ شیخ ابو اسحٰق کے عہد مسرت و شادکامی کے اختتام کا ماتم ہے جس کے لیے خواجہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے ؎

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی — خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

اسی لطف و مسرت کے زمانہ میں ابو اسحٰق کے دربار کے درخشندہ جواہر پانچ تھے، ایک خود بادشاہ ابو اسحٰق انجو جس نے دل کھول کر داد عیش دی، بقول حافظ ع

کہ جاں خویش بپرورد و داد عیش بداد

دوسرا اس کی سلطنت کا منتظم قوام الدین حسن (حاجی قوام) جس نے داد و دہش اور انعام و اکرام سے اہل شیراز کے دل کو موہ لیا تھا، تیسرے قاضی وقت مجد الدین، چوتھے علامہ دوراں عضد الدین ایجی جن کی "المواقف فی الکلام" ان کی زندگی ہی میں قبول عام و بقائے دوام حاصل کر چکی تھی، اور پانچویں اس عہد کے صوفی اعظم شیخ امین الدین،

شیخ ابو اسحٰق، قاضی مجد الدین اور قاضی عضد کا تسنن مسلم ہے، مگر حاجی قوام کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی یقینی علم نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"ان کے تسنن کا یقینی علم تو نہیں ہے مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی مذہب کے پیرو تھے"

کیا اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب ان قرائن کا اظہار فرما دیتے" جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی مذہب کے پیرو تھے" اور شیخ امین الدین کے تسنن پر محض قرائن سے استدلال کیا ہے، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۳) تیسرا قرینہ ڈاکٹر صاحب نے خواجہ حافظ کے تسنن پر یہ قائم کیا ہے کہ

"جتنے عرفاء سے حافظ کے روابط کا پتہ چلتا ہے وہ سب اہل تسنن تھے"۔

مگر یہ دلیل بھی موثر نہیں عرفائے وقت میں سے ڈاکٹر صاحب نے چار عرفا کا حوالہ دیا ہے، شیخ امین الدین سید ابو الوفا، شیخ زین الدین ابو بکر تایبادی اور شاہ نعمت اللہ ولی ماہانی،

شیخ امین الدین کے تسنن کی دلیل خواجوئے کرمانی کی مثنوی "گل و نوروز" ہے، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ خواجوئے کرمانی کو ان سے ارادت تھی اور خود انھیں ابو علی دقاق سے عقیدت تھی لہذا وہ سنی تھے اور خواجہ صاحب کے اس شعر

دگر بقیۂ ابدال شیخ امین الدین — کہ یمن ہمت او کارہائے بستہ کشاد

کو بھی ان کے تسنن کی دلیل میں پیش کیا ہے، لیکن یہ استدلال ایسے اصول پر مبنی ہے جو ناقابل تسلیم ہے، پھر خواجوئے کرمانی کا تسنن و تشیع خود غیر متیقن ہے، منقبت کے ان اشعار کے بعد یہ مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ بنجاتا ہے ؎

کاشف سر خلافت راز دار لوکشف — قاضی دین نبی مسند نشین ہل اتیٰ

سرو بستان امامت در دریای ہدیٰ — شمع ایوان ولایت نور چشم اولیا

اور اس شعر کے بعد تو خواجو کے تشیع سے انکار اور بھی مشکل ہو جاتا ہے،

رہ بمنزل برد و ہر کو مذہب حیدر گرفت — آب حیواں یافت ہر کو خضر را رہبر گرفت

سید ابو الوفا کی جانب مولانا جامیؒ نے اشعۃ اللمعات میں ایک "منظوم پرسش" منسوب کی ہے،

ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اس منظوم پرسش سے "سید مذکور کے تسنن کا اندازہ ہوتا ہے" معلوم نہیں فاضل ڈاکٹر کی اس سے کیا مراد ہے، کیا تسنن کا مغز حضرات صوفیہ کی ان ہی الغاز میں مضمر ہو اگر ایسا ہے تو پھر عرفائے شیعہ بھی الغاز و شطحیات کے مصنفین کے تسنن کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور اگر محض علامہ جامی کے اعتنا کی وجہ سے یہ حضرات سنی ہیں تو پھر ڈاکٹر معین کے اس قول پر کہ

"ایلچی تیمور کے زمانہ میں شیعہ علما، و عرفا بھی موجود تھے جن میں .... امیر سید علی ہمدانی قابل ذکر ہیں"

کیوں تبصرہ نہیں کیا جبکہ شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ کے تشیع پر ان سے اختلاف کیا ہے، امیر سید علی ہمدانی کا تذکرہ بھی تو مولانا جامی نے بڑی عقیدت مندی سے کیا ہے۔

"امیر سید علی شہاب بن محمد الہمدانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ جامع بودہ است میان علوم ظاہری و باطنی، وے را در علوم اہل باطن مصنفات مشہور است ...... صحبت ہزار و چہار صد ولی را دریافت" (نفحات الانس جامی ص ۲۹۰)

خواجہ حافظ نے شیخ زین الدین تایبادی کی بھی مدح کی ہے، ان کا زہد و عرفان مسلم ہے، مگر یہ چیز نظر انداز کرنے کے لایق نہیں ہے کہ شاہ شجاع نے جن وجوہ سے بھی حافظ کے اس شعر پر کہ

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد — وائے گر در پس امروز بود فردائے

گرفت کی ہو، روایت مشہور کے مطابق شیخ زین الدین ابوبکر تایبادی کے مشورے سے حافظ نے اس سے پہلے حسب ذیل شعر کا اضافہ کر کے اپنا پنڈ چھڑایا ؎

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت — بر در میکدۂ با دف و نئے ترسائے

لیکن سیاسی و انتظامی حقایق ہمیشہ افسانوں کے پردوں میں مستور ہو جایا کرتے ہیں، غالباً خاندان انجو اور آل مظفر کی کشمکش میں حافظ کا رجحان شاہ ابو اسحٰق کی جانب تھا، اسلیے شاہ شجاع

کا دل ان کی جانب سے صاف نہ تھا، اور ان دونوں کے روابط کے جو واقعات محفوظ ہیں ان میں یہ منافرت ہر جگہ نمایاں ہے، کہیں یہ لکھا ہے کہ خواجہ نے یہ کہکر کہ "تو ان و رنگارنگی کے باوجود میرے شعر چار دانگ عالم میں مشہور ہو جاتے ہیں، اور حریفوں کے شعر شیراز کے باہر بھی نہیں جاپاتے" شاہ شجاع پر تعریض کی تھی، کہیں حافظ کے ان شعروں کا مشار الیہ عماد فقیہ اور ان کی بلی کو بتایا جاتا ہے ؎

صوفی نہاد دام و سرِ حقہ باز کرد — بنیاد مکر با فلکِ حقہ باز کرد

اے کبک خوش خرام کجا میروی بناز — غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

شاہ شجاع نے جب اپنے باپ امیر مبارز الدین محمد مظفر کو تخت سے اتار کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی تھی تو خواجہ حافظ نے اس کی پدر کشی پر یہ شعر کہا تھا۔

آنکہ روشن بد جہان بینش بدو — میل در چشم جہان بینش کشید

ان واقعات کے بعد شاہ شجاع کا دل حافظ سے کس طرح صاف رہ سکتا تھا، وہ ان کے پھانسنے کی فکر میں تھا، اس لیے خواجہ بھی اس کی تالیف قلب کے لیے اسکی مدح سرائی کرتے تھے۔

جبین و چہرۂ حافظ خدا جدا مکناد — ز خاک بارگہ کبریائے شاہ شجاع

مگر اس سے اس کی کدورت دور نہ ہوئی، آخر کار اسے ع "وائے گر در پس امروز بود فردائے" کا بہانہ ہاتھ آگیا اور احتساب مذہبی کے شکنجہ میں کس دیا، غالباً حافظؒ نے شیخ ابوبکر تایبادی سے سفارش کرائی اور ان کی سعی و سفارش سے رہائی ہوئی، جس کے لیے یہ افسانہ تراشا گیا کہ ان کے مشورے سے حافظ نے ایک بیت اور بڑھا کر اپنا قول "ترسا" کے سر تھوپ دیا، بہر حال اس تشکر و امتنان کے عوض خواجہ پر شیخ ابوبکر تایبادی کی مدح سرائی واجب تھی اور انھوں نے کی۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب کو اعتراف ہے کہ

"ان سے حافظ کے تعلقات عقیدتمندانہ نہ تھے...... اور حافظ نے ان پر تعریض کی ہو"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "باوجود اس کے شاہ کے تسنن کے زبردست قرائن موجود ہیں"۔ کیا اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب ان "زبردست قرائن" کو بھی سپرد قلم فرما دیتے، لیکن غالباً حافظ کا تسنن اس وقت بھی ثابت نہ ہوتا کیونکہ (بقول ان کے) حافظ کو ان سے عقیدت نہ تھی۔

(۴) چوتھا قرینہ ڈاکٹر صاحب نے حافظ کے تسنن پر یہ قائم کیا ہے کہ حافظ کے اساتذہ سنی المذہب تھے، لیکن یہ دلیل اصول اور واقعہ دونوں حیثیتوں سے محل نظر ہے۔

(۱) اصولی حیثیت سے اس لیے کہ اس دلیل کو ماننے کے لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فرقہ شیعہ اس درجہ تنگ نظر ہے کہ غیر شیعہ اساتذہ سے علم بھی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جو بداہۃً غلط ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ طلب علم کے باب میں کبھی اس تنگ نظری کا خیال تک نہیں کیا گیا، سنی شیعہ کے سامنے شیعہ سنی کے سامنے، معتزلی حشوی کے سامنے حشوی معتزلی کے سامنے حنفی شافعی کے سامنے شافعی حنفی کے سامنے، اور اسی طرح ایک فرقہ کا پیرو دوسرے فرقہ کے پیرو کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا رہا، "الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن" ہمارا اصل الاصول رہا ہے، مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ایک عقیدتمند شاگرد عبقات کا مصنف تھا، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، بہرحال ڈاکٹر صاحب کی یہ دلیل کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہے، خود ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے

"حافظ کے تسنن کے زیادہ قوی قرینے ہیں، لیکن کوئی ایک بھی ایسا مستحکم قرینہ نہیں جس کی بنا پر کوئی بات بطور قطع و یقین کے کہی جاسکے"۔

(ب) واقعاتی حیثیت سے: ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ

"حافظ کے اساتذہ میں ڈاکٹر معین نے دوسرے ماخذوں سے تین نام گنائے ہیں (حافظ

...شمس الدین عبداللہ شیرازی، میر سید شریف جرجانی، قاضی عضدالدین ایجی"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ان میں سے شمس الدین عبداللہ کے متعلق تفصیل نہیں معلوم ہوسکی"۔

اس لیے یہ دعوی ابھی قبل از وقت ہے کہ وہ حافظ کے استاد تھے محض ڈاکٹر معین کی سند پر اس کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، جب کہ خود ڈاکٹر صاحب نے بہت سے امور میں ڈاکٹر معین سے اختلاف کیا ہے، کیا اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر صاحب قدیم ماخذ و مصادر سے اس تلمذ کا حوالہ دیتے!

درحقیقت "حافظ شیریں سخن" کے مصنف نے صرف ظنون و احتمالات پر اپنے قیاس کی عمارت قائم کی ہے،

"پیدا است با اہمیتے کہ قاضی در دربار شاہ شجاع داشتہ و خواجہ نیز بہمین وجہ در آں دیار محترم بود باید خواجہ ازو استفادہ بردہ باشد و حتی کتب و تصانیف او آشنائی داشتہ باید دائرۃ المعارف اسلامی نیز نویسد:

محتمل است کہ قاضی عضد استاد حافظ بودہ است"۔

اس استدلال کی قوت کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کرسکتے ہیں، دو اہل کمال جو اپنے اپنے فن کے امام ہوں اگر ایک ہی دربار سے وابستہ ہوں تو معلوم نہیں کس منطق کے ذریعے ایک کو دوسرے کا استاد کہا جائے گا۔ اکبر کے دربار میں نورتن تھے اور ان میں سے شاید ہی کوئی دوسرے کے خوانِ علم کا زلہ بار ہو، اس کے بعد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اس احتمال (بعید) کے باب میں کچھ مزید کہنا بیکار ہے،

رہا ڈاکٹر معین کا یہ احتمال کہ ایک دربار سے دونوں کی وابستگی کی بنا پر ضروری ہے کہ

حافظ نے قاضی عضد سے استفادہ کیا ہو بغیر کسی سند کے ناقابل تسلیم ہے، خصوصاً اس شکل میں جب کہ اکثر امور میں دونوں کے افکار و تعلیمات کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں ہے، اسکی تفصیل آگے آرہی ہے،

البتہ یہ صحیح ہے کہ حافظ اپنے معاصرین کی تصانیف سے واقف و آشنا تھے، وہ خود قاضی عضد کی "المواقف فی الکلام" کا بڑی تعظیم و تکریم سے ذکر کرتے ہیں:

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف
بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

لیکن کتب و تصانیف سے آشنائی تلمذ کی دلیل نہیں ہوسکتی، پھر قاضی عضد کی عظمت و شہرت شیراز کی چہار دیواری ہی میں محدود نہ تھی، بلکہ دور دور تک ان کے فضل و کمال کا شہرہ پھیل چکا تھا، ہندوستان میں بادشاہ محمد تغلق ان کے ورود مسعود کا مشتاق تھا، اس نے اپنی مملکت کے سب سے بڑے عالم معین الدین عمرانی کو قاضی صاحب کے بلانے کے لیے شیراز بھیجا، سبحۃ المرجان میں ہے:

ارسلہ السلطان محمد بن تغلق شاہ ولی الھند المتوفی سنۃ ثنتین وخمسین وسبعمائۃ الی القاضی عضد الایجی بشیراز واتحف الیہ ھدایا غیر محصورۃ والتمس بالھند قدومہ واستسقی بھدہ الارض غیوثہ فامسکہ السلطان ابو اسحٰق و ر ج تقییدہ بسلسلۃ الاحسان علی الاطلاق" (سبحۃ المرجان ص ۳۴)

سلطان محمد بن تغلق بادشاہ ہندوستان المتوفی ۷۵۲ھ نے معین الدین عمرانی کو قاضی عضد الدین ایجی کے پاس شیراز بھیجا اور ان کے ہمراہ بہت سے تحفے بھیج کر ان سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی اور اپنے ابر کرم سے اس سرزمین کو سیراب کرنے کی خواہش کی، لیکن

شیخ ابو اسحٰق انجو نے انھیں روک لیا اور احسان کی زنجیر سے ان کی آزادی پر قید وطن کو ترجیح دی،

اسی طرح "المواقف فی الکلام" شائع ہونے سے پہلے ہی اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ مختلف فرمانروا چاہتے تھے کہ یہ ان کے نام پر معنون کی جائے، قاضی عضد نے خود اسکے دیباچہ میں اس کی اہمیت اور اس کے طلبگاروں کی کثرت کے بارے میں لکھا ہے:

بکرا من ابکار الجنان ...... وکنت برھۃ من الزمان اجیل رای وامر نفسی و اشاور ذوی النھی من اصدقائی مع تعدد خاطبیھا وکثرۃ الراغبین فیھا۔

یہ کتاب دوشیزگان فردوس میں ایک دوشیزہ ہے ...... میں عرصہ تک متردد تھا اپنے دل میں سوچتا تھا اور اپنے عقلمند دوستوں سے مشورہ کرتا تھا کہ اسے کس کے نام معنون کروں، حالانکہ اسکے طلبگار بہت تھے اور انھیں اسکی بہت زیادہ خواہش تھی،

ان طلبگاروں میں حسب تصریح میر سید شریف محمد بن تغلق بھی تھا، چنانچہ وہ تعدد خاطبیھا کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومن جملۃ خاطبیھا سلطان الھند محمد شاہ جونہ (شرح المواقف دیباچہ ص ۱۲)

اور جن طلبگاروں نے اس دوشیزۂ علم و حکمت سے شادی کا پیغام دیا (المواقف فی الکلام اپنے نام پر معنون کرنے کی خواہش ظاہر کی) ان میں بادشاہ ہندوستان محمد تغلق المعروف بہ محمد جونا بھی تھا

ایسی مشہور کتاب سے کیسے واقفیت نہ ہوگی، قاضی عضد اور ان کی "المواقف فی الکلام" وغیرہ ابواسحٰق کے دربار کا درخشندہ گوہر ہے، اور گو اس کی حکومت "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کا مصداق بن کے رہ گئی، مگر دربار بواسحاقی کا یہ درخشندہ گوہر رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ ایسے گوہر شاہوار سے حافظ کس طرح صرف نظر کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر معین کا مزعومہ "استفادہ محتملہ" بھی شاگردی کو ثابت نہیں کر سکتا، غالب نے اپنے بہت سے اشعار میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے فرمانے سے حک و اصلاح کی، چنانچہ اپنے ایک قصیدہ کی تشبیب میں لکھا تھا۔

ہمچناں در تتق غیب نمودے دارند   بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیان

مولانا فضل حق مرحوم نے سن کر کہا کہ "اعیان ثابتہ" کے لیے "نمودے" کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ "ثبوتے" ہونا چاہیے، چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے "نمودے" کے "ثبوتے" بنا دیا، اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں، مگر اس استفادہ کی بنا پر کسی نے مرزا کو مولانا فضل حق کا شاگرد ٹھہرایا نہ ہم مذہب۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز میر سید جرجانی کے تلمذ کا دعویٰ ہے، میر سید کا سال وفات ۸۱۶ھ بلکہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی تحریر کے مطابق تو ۸۲۶ھ ہے، اور حافظ کا انتقال ۷۹۱ھ میں ہوا، اب اگر میر سید شریف نے غیر معمولی پیرانہ سالی میں اور حافظ نے عمر طبعی سے بہت پہلے انتقال نہیں کیا تو دونوں کی عمر میں تقریباً وہی تفاوت ہونا چاہیے جو دونوں کے سال وفات میں ہے، یعنی حافظ میر سید شریف سے پچیس سال اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی تصریح کے مطابق پینتیس ۳۵ سال بڑے تھے، شاگرد کا استاد سے اتنا زیادہ معمر ہونا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کہیں اس کا ذکر نہ ہوتا، فرض کیجیے کہ سید شریف بیس سال کی عمر میں مسند درس و تدریس

پر بیٹھے ہوں اور حافظ ان کے اولین تلامذہ میں سے ہوں تب بھی اس وقت شاگرد کی عمر پینتالیس یا پچپن سال ہوگی، یہ واقعہ اگرچہ ناممکن نہیں ہے، لیکن غیر معمولی ضرور ہے، جس کا ذکر ضرور کہیں نہ کہیں ملتا، مگر کسی نے اس کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میر سید شریف ۷۴۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور خواجہ حافظ ۷۴۵ھ میں علم و فضل کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ حاجی قوام الدین حسن وزیر نے ان کے لیے خاص طور سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں بیٹھ کر وہ فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے، یعنی ابھی میر سید کی عمر صرف پانچ سال کی تھی (یا بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے سات سال) کہ خواجہ حافظ تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھا رہے تھے، میر سید شریف تو ابھی اس قابل بھی نہ ہوئے تھے کہ خواجہ سے پڑھ سکیں، سید شریف اپنے وقت کے علامہ اور یگانۂ روزگار سہی لیکن ایسے شاگرد کی استادی کی کیا توجیہ ہے جو ان کی پیدائش کے وقت ہی بہت بڑا استاد کامل تھا۔

اب ذرا قاضی عضد اور میر سید شریف کے افکار و تصورات کا حافظ کے تصورات سے مقابلہ کیجیے، ماتن اور شارح (قاضی عضد اور میر سید شریف) نے "المواقف" کے چوتھے مرصد میں اس بات پر بحث کی ہے کہ آیا "حقائق اشیا ثابت ہیں یا نہیں"۔ اس بحث میں مختلف فرقوں کی رائیں نقل کرنے سے قبل انھوں نے اپنا مسلک یہ بتایا ہے کہ "حسیات اور بدیہیات دونوں قابل اعتماد ہیں"۔ چنانچہ شرح مواقف میں ہے:

المرصد الرابع فی اثبات العلوم	چوتھا مرصد علوم ضروریہ کے اثبات میں
الضروریة.... ینقسم الی	......ان کی دو قسمیں ہیں...
الحسیات..... والبدیھیات	....حیات..... اور بدیہیات

...... والناس فیہا فرق اربع	...... اس مسئلے میں لوگوں کے چار فرقے
الفرقة الاولى المعترفون بها	ہیں، پہلا فرقہ دونوں کی صحت کا معترف
وهم الاكثرون الظاهرون	ہے، اس فرقہ کی اکثریت ہے یہ لوگ حق
على الحق القويم والصراط المستقيم	پر ہیں ...... چوتھا فرقہ ان دونوں
...... الفرقة الرابعة	کا منکر ہے ...... ان میں سب سے بہتر
المنكرون بها ...... واشلهم	لاادریہ (Sceptics) ہیں جو توقف
لاادرية القائلون بالتوقف	کے قائل ہیں ...... ان میں ایک اور
...... ومنهم فرقة	فرقہ ہے جس کا نام عنادیہ (Nihilists)
اخرى يسمى بالعنادية	ہے ...... ان کا دعویٰ ہے کہ ہمیں یقین
يدعون انهم جازمون بان	ہے کہ کوئی چیز سرے سے موجود نہیں
لاموجود اصلا ...... ومنهم	...... ان میں ایک تیسرا فرقہ ہے جسکا
فرقة ثالثة يسمى بالعندية	نام عندیہ ([illegible]) ہے
وهم قائلون بان حقائق	وہ اس بات کے قائل ہیں کہ حقائق
الاشياء تابعة للاعتقادات	اشیاء اعتقادات کے تابع ہیں
دون العكس	نہ کہ اس کا عکس

اس سے قاضی عضد اور میر سید شریف کا مذہب متعین ہوگیا کہ وہ حسیات اور بدیہیات دونوں کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے چوتھا مرصد ہی علوم ضروریہ کے اثبات میں لکھا اور ان کے منکرین کے دلائل کا جواب دیا ہے، نیز حسیات اور بدیہیات دونوں کو قابل اعتماد سمجھنے والوں کو "علی الحق القویم والصراط المستقیم" کا مصداق بتایا ہے، اس کے برعکس

ارتیابیوں اور لاادریہ کو سوفسطائیہ کہہ کر ناقابل تخاطب قرار دیا ہے، بلکہ آخر میں تصریح کردی ہے کہ

"والمناظرة معهم اى السوفسطائية قد منعها المحققون من العلماء"۔

اس کے بعد پانچ مرصد میں نظر و استدلال کی افادیت کے بارے میں قول محقق کے سلسلے میں جو خود ان دونوں کا بھی مختار ہے، فرماتے ہیں کہ بحث و نظر سے حقائق کائنات کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔

المقصد الثالث النظر الصحيح	تیسرا مقصد، نظر صحیح ...... جن چیزوں میں غور
...... يفيد العلم بالمنظور فيه	کیا جائے اس کے متعلق جمہور کے نزدیک وہ
عند الجمهور ...... والمنكرون	علم کا فائدہ دیتی ہے ...... اس مذہب کے
طوائف ...... الطائفة الاولى	منکرین کے کئی گروہ ہیں ...... پہلا گروہ
من انكر افادته للعلم مطلقاً	بالکل افادہ علم کا منکر ہے، اس کا گمان ہے
اى زعم انه لا يفيد اصلاً	کہ نظر سے نہ مسائل الٰہیات میں علم حاصل
لا فى الالهيات ولا فى غيرها	ہوتا ہے نہ غیر الٰہیات میں ...... دوسرا
...... الطائفة الثانية من	گروہ منکرین افادہ نظر کا مہندسین کا ہے
المنكرين المهندسون قالوا	وہ کہتے ہیں کہ نظر صرف ہندسہ اور
انه اى النظر يفيد العلم	حساب کے مسائل میں علم کا فائدہ
فى الهندسيات والحسابيات	دیتی ہے ...... مگر مسائل الٰہیات
...... دون الالهيات	میں نہیں ...... تیسرا گروہ ملاحدہ
الطائفة الثالثة الملاحدة	و فرقہ باطنیہ کا ہے، ان کا قول ہے کہ

قالوا النظر لا يفيد العلم
نظر اللہ تعالیٰ کی معرفت میں بغیر معلم (امام)

بمعرفة الله بلا معلم يرشدنا
کے فائدہ نہیں دیتی جو ہماری رہنمائی کرے

یہ تو ان مبینہ "اساتذہ" کا مسلک ہے، اب مزعومہ "شاگرد" کی لاادریت ملاحظہ ہو وہ حصول علم سے قطعاً مایوس ہیں،

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود
گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ امکاں را

دوسری جگہ فرماتے ہیں

برو اے زاہد خودبیں کہ ز چشم من و تو
راز ایں پردہ نہان است و نہان خواہد بود

وہ علمی کاوشوں کو بیکار اور لہو و لعب سے بھی فروتر سمجھتے ہیں،

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

بلکہ بعض اوقات تو وہ لاادری (sceptic) سے بڑھکر عنادی (Nihilist) بنجاتے ہیں

طرۂ شاہد دنیا ہمہ مکر است و فریب
عارفاں بر سر ایں نکتہ نجویند نزاع

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

جہان و کار جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق

اس لاادریت کے ساتھ وہ نظر صحیح کی افادیت کے بھی منکر ہیں، اور ان کا رجحان منکرین نظر کے تیسرے گروہ کی جانب ہے، جن کا خیال تھا کہ بلا معلم (مرشد کامل) کے منزل عرفان تک رسائی نہیں ہو سکتی؛

سرِ خدا کہ سالکِ عارف بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ایسے معلم کے لیے جو حقایق و معارف کا اخذ و کسب براہ راست بارگاہ قدس سے کرتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے منازل عرفان کے طے کرنے کی ہرچند سعی کی لیکن اس معاملہ میں کامیاب دیکھا تو معلم مرشد ہی کو جس نے براہ راست روز ازل ہی میں اسے پالیا تھا ؎

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
و اندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

ایسا معلم مرشد معصوم عن الخطا (Infallible) ہے اور اس کی ہر بات واجب التعمیل ہے، خواہ عقل و شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

غرض تعلیم و تدریس کی منزل اولیں "امکان علم کا اثبات" اور "علوم ضروریہ کا ثبوت" ہوا کرتی ہے، لہذا جس نے قاضی عضد اور میر سید شریف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا یا ان سے استفادہ کیا یا ان کا اثر قبول کیا ہو، اس نے یقیناً یہ طے کیا ہوگا کہ حقایق اشیا ثابت ہیں اور انکا علم قابل حصول ہے، علوم ضروریہ کے اثبات کے بعد حوادث کائنات کو "بازیچۂ چرخ حقہ باز" نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ "طرۂ شاہد دنیا" کو "مکر و فریب" کہا جاسکتا ہے، نہ "جہان و کار جہاں" کو "ہیچ در ہیچ" بتایا جاسکتا ہے اور نہ اپنے وجود کو فسون و فسانہ کہکر عنادیت (Nihilism) پر اصرار کیا جاسکتا ہے، اسی طرح "نظر صحیح کی افادیت" کا مذہبِ جمہور ماننے کے بعد اسرار کائنات کے حل پذیر ہونے سے مایوسی نہیں ہو سکتی،

قاضی عضد، میر سید شریف اور خواجہ حافظ کے مسالک واضح ہو جانیکے بعد بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ خواجہ حافظ نے قاضی عضد اور میر سید شریف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا یا ان سے استفادہ کیا تھا یا نہیں، لیکن ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے نزدیک یہ تلمذ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور وہ بلا تامل فرماتے ہیں۔

"اسی طرح حافظ کے استاد علامہ میر سید شریف جرجانی نے بھی کشاف پر حاشیہ لکھا۔"

برید فرنگ

برسلز ۸ر فروری ۱۹۵۷ء

مجی صباح الدین عبد الرحمن صاحب   سلام و رحمت

ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی ہے اور میں نیم شب کے سناٹے میں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں، سوال یہ ہے کہ دن کے وقت کیوں نہیں لکھا؟ شب بیداری تو درویشوں کا مسلک ہے یا پھر یہ لمحات اہل نشاط کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں، اور میں نہ صوفی ہوں اور نہ مرزا غالب کی طرح اسکا دعوی کر سکتا ہوں کہ

صاف دردکش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

بات یہ ہے کہ میں باوجود سنجیدگیوں کے ایک لاابالی انسان ہوں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مجلس سے لوٹا اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت شروع کر دی یا پھر طلوع سحر سے پہلے جب کہ سکون کا عالم ہوتا ہے، حواس مجتمع ہوتے ہیں تو دیوان حافظ لے کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں، حالانکہ اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجہ میں متنبہ بھی کر دیا تھا۔

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

جب دفتر جاتا ہوں تو کاموں کا ہجوم ہوتا ہے، جب اس دنیا سے نکلتا ہوں تو پھر شام کو کسی وقت کسی مجلس میں شرکت کا خیال آتا ہے۔ اس طرح فرصت ہی نہیں ملتی کہ اطمینان سے بیٹھ کر آپ جیسے مخلص دوست سے مخاطب ہو سکوں، اس لیے سوچا کہ کل تو اتوار ہے، کیوں نہ اسی وقت

چند سطریں لکھ ڈالوں، یہ ہے شان نزول اس عریضہ کی! ہاں "معارف" کا شکریہ تو ادا کرنا بھول ہی گیا، آپنے ہمارے چند خطوط شائع کر ہی ڈالے مگر

میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

میں نے جب اپنے خطوط کو پڑھا تو بیساختہ ہنسی آئی دیر تک سوچتا رہا کہ آخر ان خرافات میں آپ کو کون سی کرن نظر آئی جسے آپنے "معارف" کے افق پر پھیلانا مناسب سمجھا، "معارف" اردو زبان کا ایک علمی رسالہ ہے، بلند پایہ اور باوقار اور ہماری تحریر میں یاوحشت کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے، پھر خیال آیا کہ شاید یہی آشفتہ بیانی آپ کو پسند آگئی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان میں معیاری خطوط بہت ہی کم ہیں، یوں ہمارے ادیبوں نے اپنے خطوط بڑی آب و تاب سے شائع کیے، ان پر تقریظ بھی لکھوائی، مگر مرزا غالب اور مولانا ابو الکلام آزاد کے سوا اور کوئی اہل قلم معیار پر پورا نہیں اترا، دونوں کے ہاں بے پناہ انفرادیت ہے، تحلیل نفسی ہے اور انداز بیان میں شخصیت اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جھلکتی ہے، پھر یہ بھی ایک مسلمہ بات ہے کہ ان دونوں ہستیوں نے خطوط اس لیے نہیں لکھے کہ ان سے شہرت میں اضافہ ہو، مغربی زبان میں خصوصاً فرانسیسی میں خطوط نویسی خود ایک مستقل ادبی موضوع ہے، اور اس فن میں جو شہپارے آپ کو نظر آئیں گے ان سے ان کے بلند پایہ ادب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ہمارے متقدمین علما جنھوں نے کوفہ، بغداد، بصرہ اور قرطبہ میں ادبی چراغ روشن کیے، ان کے کارناموں کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بیشتر نے اپنی کتاب کی ابتدا کسی عزیز دوست کے خط کے جواب سے کی ہے، مثلاً الجاحظ کو دیکھیے جس نے دوستوں کے نام کتابی خطوط لکھ ڈالے تھے، تونس کے مایۂ ناز نگار ابن رشیق، اور اسی طرح قرطبہ کے مصنفین نے یہی طرز اختیار کیا تھا جاحظ کی جو تصویر دار المکتب المصریہ نے شائع

کی تھی، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ قسم کا انسان تھا حالانکہ اس میں جو زندہ دلی تھی، وہ ہمارے ہاں خسرو اور غالب ہی کے یہاں آپ پائیں گے، وہ جاحظ جس کے بارے میں ابن خلدون نے کہا تھا کہ "ہم کالجوں میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتے تھے کہ اصول ادب اور اس کے ارکان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چار کتابوں کا پڑھنا ازبس لازمی ہے یعنی جاحظ کی کتاب البیان والتبیین، ابو علی قالی بغدادی کی الامالی، المبرد کی الکامل اور ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب"، اور ذرا اس کی شوخی ملاحظہ ہو کہ جب سلام بن یزید الاندلسی دشوار گذار منزلیں طے کر کے جاحظ سے ملنے کے لیے بصرہ پہنچے تو لوگوں سے پوچھتے ہوئے ان کے مکان تک پہنچے، اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک سن رسیدہ بزرگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے گرد تقریباً بیس نوجوان طلبہ کا حلقہ ہے، الاندلسی نے سلام کے بعد پوچھا کہ آپ میں سے ابو عثمان (جاحظ کی کنیت) کون ہیں؟ جاحظ نے کہا جی ہاں فرمائیے آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اندلس سے، جاحظ نے کہا اندلس سے، وہ تو حمقوں کی سرزمین ہے، پھر جب نام پوچھا تو انھوں نے کہا سلام، اسپر جاحظ نے کہا، اس کی بھی ایک رہی، یہ تو ایک کتے کا نام ہے، اور آپ کے والد ماجد کا نام؟ اندلسی نے کہا ابو خلف، ارشاد ہوا واہ وا کیا نام ہے، یہ تو در اصل زبیدہ کے بندر کی کنیت ہے، اور ہاں یہ تو بتائیے کیسے آنا ہوا؟ پریشان حال اندلسی نے کہا علم سیکھنے کے لیے، اس پر جاحظ نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا آپ علم نہیں سیکھ سکتے الٹے پاؤں واپس تشریف لیجائیے، ذرا اندازہ کیجیے اس طالب علم کی سراسیمگی کا جس نے محض جاحظ سے علم سیکھنے کے لیے یہ طویل سفر اختیار کیا تھا، اور جب منزل پر پہنچا تو یہ تحقیر آمیز جواب ملا، اس نے بڑی منت وسماجت کی، اس کے بعد علامۂ روزگار ذرا مسکرائے پھر کہنے لگے مرد خدا! علم کی خاطر آئے ہو اور ہمارے مکان میں داخل ہونے کے بعد یہ بھی

نہیں دیکھا کہ اس جماعت میں ہمارے سوا اور کسی کی داڑھی نہیں ہے، کم سے کم اتنا تو سمجھا ہوتا کہ داڑھیل صرف جاحظ ہی ہو سکتا ہے، اس کے بعد اندلسی کی "خطاؤں" سے درگذر کرے اور اپنے حلقہ میں شامل کر لیا، ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ برسلز یونیورسٹی کے شہرۂ آفاق استاد ابل (Abel) صاحب نے ہمارے غریب خانہ کو نوازا، یہ شعبہ عربی کے استاد ہیں اور مجھ پر اکثر کرم فرمایا کرتے ہیں، باتوں ہی باتوں میں جب جاحظ کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ یہ حیرت انگیز دماغ کا مالک قبل از وقت پیدا ہو گیا، اسے تو فرانسیسی روسو کا ہمعصر ہونا چاہیے تھا، وہی روسو کے سے تیور ہیں، وہی تعمق اور وہی انسانی محبت، پھر چار کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے، یہ شخص صحیح معنوں میں ایک متحرک کتبخانہ تھا، جہاں ہزاروں علوم کی کتابیں جمع رہتی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ بعد کے مصنفین نے جن رسالوں کو جاحظ کے نام سے منسوب کر دیا تھا، ان پر تنقیدی نظر ڈالی جائے، اگر ان یکتائے روزگار اہل علم کے زمانے میں ٹائپ رائٹر ہوتا اور مختصر نویس تو یقین افوان میں سے ہر عالم ایک لائبریری چھوڑ جاتا، اللہ اللہ وہ بھی کیا انسان تھے جنھوں نے محض علم کی ترقی کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور ایسے موضوع پر کتابیں لکھ ڈالیں جن کی بازار میں مانگ نہیں تھی، زمانے کی رو میں ہر مصنف بہہ جایا کرتا ہے، مگر حیات جاوید ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو وسعت نظر کے ساتھ اپنے سینہ میں کشادگی بھی رکھتے ہیں، کچھ خطوں کے بارے میں کہہ رہا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ اس عربیت سے تنگ آ گئے ہوں گے، اس لیے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہیے۔ ابھی لکھتے لکھتے یہ خیال آیا کہ اس برفباری کے موسم میں آپ کو بلجیم کھینچ لاؤں، ایک بات اور سن لیجیے، وہ یہ کہ ہمارے شعرا جب موسم سرما کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ان کو دھوپ نظر آتی ہے، سودا کہتے ہیں:

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

اور یہاں جب زمستانی شدت دکھانی مقصود ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مارے سردی کے الو بھی اکڑا ہوا تھا، الو کی اہمیت آپ کے یہاں ہو یا نہ ہو، یہاں اسے مبارک پرندہ سمجھتے ہیں، سعدی کا ایک مشہور شعر ہے

بلبلا مژدۂ بہار بیار — خبر بد بہ بوم شوم گذار

اگر اس کا فرانسیسی ترجمہ کر ڈالوں تو لوگوں کی سمجھ سے بالاتر یہ شعر ہے کیونکہ الو تو نیک فال ہے، اس کی دونوں آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے، اور یہ آنکھیں وقت کے سینہ کو چاک کرتی ہوئی دھندلے مستقبل تک پہنچ جاتی ہیں ایک رئیس مجھے اپنی عمارت دکھا رہے تھے، جب وہ آراستہ خوابگاہ میں لے گئے تو دیکھا کہ مسہری کے قریب میز پر ایک خوبصورت الو چوبی لباس میں بیٹھا ہوا ہے، اور اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں برقی قمقموں سے بنی ہیں، ذرا اندازہ کیجئے اس فرنگستانی کی قسمت کا جسے صبح و شام الو کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔

اے وائے بہارے اگر این است بہارے

سگار اب ختم ہوا چاہتا ہے اس لیے آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں، اے کاش فرصت کے لمحات میسر ہوتے، کوئی سنجیدہ سا مضمون معارف کے لیے لکھ ڈالتا، مگر "افکار معیشت کبھی فرصت ہی نہیں دیتے" اور ہاتھ ملکر رہ جاتا ہوں کہ اس قلم سے خرافات کی بجائے حیات افروز سطریں نہ لکھ سکا

جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

آپ کو دیکھے ہوئے زمانہ گذر چکا ہے، پتہ نہیں کب ملاقات ہوگی، یہی کیا کم ہے کہ خطوں کے بہانے نصف ملاقات تو ہو جایا کرتی ہے۔

محبت کیش اختر امام

ادبیات

غزل

از مرزا احسان احمد صاحب

یہ کون زخمیٔ پیکان یار آتا ہے — بنا ہوا ہمہ تن لالہ زار آتا ہے

تڑپ یہ درد کی گو صبر آزما ہے بہت — اسی سے دل کو مگر کچھ قرار آتا ہے

طریق عشق میں ہر لحظہ ہوش ہو در کار — نہ جانے سامنے کب حسن یار آتا ہے

وہی ہے آبلہ پا یانِ عشق کی منزل — قدم قدم پہ جہاں خار زار آتا ہے

جھپک گئی جو نظر، پھر نہ کر تلاش اسکو — نظر وہ جلوہ فقط ایک بار آتا ہے

متاعِ مے کدہ ہر رند کو نہیں ملتی — اسی کو ملتی ہے جو ہوشیار آتا ہے

ستم طراز سمجھتے ہیں ان کو سب لیکن — نیاز عشق کو کب اعتبار آتا ہے

اٹھا ہے درد، تو رہنے دے چارہ گر اسکو — کوئی تو یاد ہمیں بار بار آتا ہے

وہ تشنگی کہ جو تھی وجہ زندگی دل کی — مٹا کے اس کو یہ کیا بادہ خوار آتا ہے

خلش سی جس کی اٹھاتا ہوں لذتیں صدہا — مجھے تو یاد وہ پیکان یار آتا ہے

یہ کیف تشنہ لبی خاک میں نہ مل جائے — "الٰہی خیر کہ ابر بہار آتا ہے"

خود اپنے ضعفِ نظر پہ نہیں نظر اسکی — خزاں کو دیکھ کے جو سوگوار آتا ہے

کبھی یہ عشق تو ہوتا ہے بے خبر یوں بھی
تلاش کرنے کو خود حسن یار آتا ہے

لگا کے آگ نشیمن کو موسم گل میں
نظر کچھ اور ہی رنگ بہار آتا ہے

اسے نصیب کہاں اوج بوریا میرا
یہ میرے سامنے کیا تاجدار آتا ہے

قطعہ

زندگی کا دوسرا رخ

از جناب سید اختر علی صاحب تلہری

زور بازوئے ستم کی وسعتوں کے شکوہ سنج
ذوق جاں بازی کا حیرت آفریں جلوہ بھی دیکھ

حسن کی ناز آفرینی ہی نہیں ہے جاں نواز
عشق شوریدہ کی سرمستی کا ہنگامہ بھی دیکھ

ہے گیاہ و خار و خس میں بھی تو اک رنگ بہار
دیکھنے والے گلستاں کے کبھی صحرا بھی دیکھ

خندہائے عیش کے دل کش ترانوں کے اسیر
آنسوؤں کا آنکھ سے بہتا ہوا دریا بھی دیکھ

اے نشاط اندوز لطف نعمت زہرہ جمال
حسن برہم کا ذرا چڑھتا ہوا پارا بھی دیکھ

کھیلنے والے گلوں سے کھیل کچھ کانٹوں سے بھی
روز روشن دیکھنے والے شب یلدا بھی دیکھ

عیش و عشرت کی چمن آرائیوں میں مبتلا
بے سر و برگی اہل عشق کا نقشہ بھی دیکھ

رنگ روئے اہل زر ہی کو نہ رکھ پیش نظر
مفلس ناکام کا اترا ہوا چہرا بھی دیکھ

زندگی کا دوسرا رخ بھی تو ہے اے شادکام
چودھویں کا چاند دیکھا ڈوبتا تارا بھی دیکھ

مطبوعات جدیدہ

فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر حصۂ اول و دوم

مرتبہ جناب مولوی افتخار احمد صاحب بلخی، چھوٹی تقطیع، قیمت ضخامت حصۂ اول عہ صفحات ۲۲۴، حصہ دوم للعہ صفحات ۴۰۸ پتہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی

پاکستان میں انکار حدیث کا فتنہ جس قدر بڑھتا جاتا تھا، اسی نسبت سے اس زہر کا تریاق بھی مہیا ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ادھر چند سال کے عرصہ میں وہاں اس کے جواب میں مفید کتابیں لکھی گئیں، ان میں ایک مذکورۂ بالا کتاب بھی ہے، اس کے پہلے حصہ کے پس منظر میں مصنف نے دکھلایا ہے کہ فتنۂ انکار حدیث کی داغ بیل خلافت راشدہ کے بعد ہی پڑنی شروع ہو گئی تھی، اور اس کا جائزہ لینے کے بعد دوسرے حصہ میں اس زمانہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی مہم اور سرگرمیوں کا تفصیلی تذکرہ ہے، جو تیسرے حصہ میں ختم ہوگا، جگہ جگہ لائق مولف منکرین حدیث کے دجل و فریب، تحریف و تلبیس، نادر اور انوکھی تحقیقات کے نمونے بھی دیتے گئے ہیں جس سے ان کی حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔ دوسرا حصہ نصف سے زائد مولانا مودودی اور ادارۂ طلوع اسلام کی آویزش کی بحث پر مشتمل ہے، جس میں مودودی صاحب پر پرویز صاحب کے اتہامات و الزامات کا جواب دیا گیا ہے، جو بہت طویل ہو گیا ہے، ایک سنجیدہ علمی بحث میں ذاتی اور شخصی قضیہ کو اس قدر طول دینا مناسب تھا،

مباحث کتاب میں رمز و کنایہ اور تلمیح سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے، مگر مصنف نے جس تلاش و محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ کتاب لکھی ہے، وہ لایق توصیف ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اس کارِ خیر کا اجر اور مسلمانوں کو اس فتنہ کی گمراہیوں اور کج اندیشیوں سے محفوظ رکھے۔

لغات الحدیث ۔ مولفہ مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت، طباعت بہتر، مجموعی صفحات ۱۰۶۰، قیمت درج نہیں، ناشر نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ، کراچی۔

علامہ وحید الزماں مرحوم کی نظر حدیث پر بہت گہری تھی، اور اس فن میں ان کی کئی کتابیں یادگار ہیں، مکمل لغات الحدیث حروف تہجی کے اعتبار سے ۲۵ پاروں (حصوں) اور ۶ جلدوں پر مشتمل ہوگی، جسے مولانا نے لغت کی مستند کتابیں پیش نظر رکھکر مرتب کیا تھا، لغات الحدیث احادیث کی لغت اور ان کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ عربی کا بھی ایک اہم لغت ہے، جس سے معمولی عربی خواں اور اردو داں طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، مصنف کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ تصنیف بھی مفید ہے، اور اردو میں لغات حدیث کے ترجمہ و تشریح پر اس سے زیادہ جامع اور مبسوط کتاب نہیں ہے،

حیات وحید الزماں ۔ مرتبہ مولانا عبد الحلیم چشتی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۵، قیمت درج نہیں، پتہ نورِ محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی،

یہ کتاب قرآن پاک اور احادیث کے نامور مترجم، لغات حدیث کے مرتب اور دوسری بہت سی اردو اور عربی کتابوں کے مصنف اور مشہور عالم مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کے حالات میں مرتب کی گئی ہے، عام سوانح نگاروں کے برعکس کتاب غلو و عقیدت اور

مبالغہ آرائی سے پاک ہے، یہی وجہ ہے کہ مصنف نے جابجا مولانا کے غیر محتاط مسلک اور غیر متوازن نقطۂ نگاہ کی حاشیوں میں تردید بھی کی ہے، جن دوسرے اصحاب علم کے نام آئے ہیں ان کے مختصر حالات بھی حاشیہ میں تحریر کر دیے گئے ہیں، کتاب مفید اور قابل مطالعہ ہے،

جوش ملسیانی ۔ مرتبہ بزم ادب پنجاب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۹۴، قیمت عہ، پتہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر)

یادگار داغ جناب جوش ملسیانی ان ماہر فن اساتذہ میں ہیں جن سے شعر و ادب کی آبرو قائم ہے، فن شاعری پر ان کی نظر بڑی گہری اور استادانہ ہے، ان کی ادبی خدمات گوناگوں ہیں، وہ ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک نہایت قابل قدر یادگار ہیں، انکی چھہترویں سالگرہ کے موقعہ پر ان کے تلامذہ اور متوسلین نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ کتاب پیش کی ہے، جس میں جناب جوش کے حالات، زندگی، شاعری اور ادبی کمالات سے متعلق ۱۳ مقالے ہیں، اور ایک مقالہ ان کے صاحبزادے جناب بال مکند عرش ملسیانی پر بھی ہے، اس مجموعہ میں ہر درجہ کے مقالات ہیں مگر زیادہ مقالات بلند اور معیاری ہیں، ہری چند اختر اور اسد ملتانی کے مقالات لایق ذکر ہیں، جناب جوش کے کمالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے شاگردوں کے حالات، نمونۂ کلام اور بعض کے فوٹو بھی شریک کتاب ہیں، شروع میں ۴۸ صفحات تک صدر جمہوریۂ ہند، وزیر اعظم مولانا ابو الکلام مرحوم، بخشی غلام محمد، دوسرے مختلف صوبائی، مرکزی وزراء، گورنروں نیز ملک کے مشاہیر اہل قلم کے بیانات اور پیغامات ہیں، غرض کتاب ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے، اور جوش صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات یقیناً اس کی مستحق ہیں، بزم ادب پنجاب بھی اس علمی قدردانی پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

فلسفۂ نماز۔ مرتبہ جناب سید محمد ہاشم صاحب شمسی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۱۰۰ صفحات، قیمت عہ پتہ از ہر بک ڈپو متصل مسجد، آرام باغ کراچی، نمبر ۱

اس کتابچہ میں دلنشین انداز میں نماز کے روحانی اور مادی فوائد کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن بعض مباحث کو اس قدر پھیلا دیا گیا ہے کہ اصل موضوع ذہن سے اوجھل ہو جاتا ہے، تاہم کتاب مفید ہے، اس کا نام "فلسفۂ نماز" کے بجائے "فوائد نماز" زیادہ موزوں ہوتا،

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ مترجمہ جناب سید احتشام حسین صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، ۱۴۸ صفحات، قیمت ۶؍ مجلد ۸؍ پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

زیر تبصرہ کتاب جان بیمز کے ایک کتابچے کا ترجمہ اور اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ہندوستانی زبانوں کی تقسیم، ارتقائی مدارج اور خصوصیات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اصل کتاب کے علاوہ ایک جامع اور مبسوط مقدمہ ہے جس سے کتاب کا افادہ بڑھ گیا ہے، آخر میں ہندوستان کی لسانی تقسیم کا ایک نقشہ دیا گیا ہے، غرض کتاب بڑی مفید، تحقیقی، جامع اور لسانیات کا مذاق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔

رسول کریمؐ۔ مرتبہ سید محمد ہادی صاحب بی اے بی ٹی (علیگ)، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت طباعت بہتر، ضخامت ۶۵ صفحات، قیمت ۸؍ پتہ: سید مختار علی صاحب، مکان نمبر ۵۰۳ گرواد پیٹھ پونا نمبر ۲

یہ مختصر رسالہ بچوں کے لیے سیرت پاک پر لکھا گیا ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح اور خلق نبوی کے سبق آموز حالات ہیں، زبان آسان و سلیس ہے۔

"ض"

نمبر ۶ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۵۸ء جلد ۸۱

فہرست مضامین